ISSN 0974-7346

اپریل ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۴

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ — ماہ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۲۳ء — عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ملک اور دنیا کے بیشتر حصوں میں اسلام، اس کے پیام اور اس کی تہذیب و ثقافت کے خلاف بظاہر نفرت وعداوت کی گرم بازاری ہے۔ شور وشرابہ میں یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ساری آوازیں عام انسانوں کی ہیں یا پھر ان کی جو اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن اقتدار، سرمایہ اور تشہیر کی زور آوازی میں ان ہی کا شور شر انگیز اوروں پر بھاری ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کی نظر میں صرف ان ہی کی نسل، ان ہی کے رنگ اور ان ہی کی معاشرت کو دوسروں پر تفوق حاصل ہے، وہ اپنے غیر انسانی حاکمانہ رویوں کے جابرانہ تسلسل کے لیے، اسلام کو اور اس کی عملی تاریخ کو سمجھے بغیر گویا ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف ہیں۔ اسلام دشمنی میں اس طبقے نے تمام حدود کو تجاوز کر کے گویا خود کو واقعی عدو مّبین ثابت کر دیا ہے۔ مغرب میں امریکہ کے بارے میں ایک رپورٹ سے ظاہر ہوا ہے کہ اسلام دشمنی کے لیے سوشل میڈیا میں وہ سب سے آگے ہے لیکن یہ سب سے طاقتور ملک بہر حال دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ نمبری ہونے میں پہلا درجہ ہمارے ملک عزیز ہی کو حاصل ہوا۔ جس ملک میں وہاں کی غالب ترین آبادی کو ذات پات کے انتہائی قابل نفریں فلسفہ کے ذریعہ ہزاروں سال سے غلام بلکہ کالانعام بنایا اور سمجھا گیا، جہاں ابلیسی نظام اتنا محکم رہا کہ خوئے غلامی میں عوام پختہ تر ہو گئے، اس کو اسلام دشمنی میں دنیا میں سب سے پیش پیش ہونا بہت زیادہ حیرت و تعجب کی بات بھی نہیں۔ تعجب تو اس پر ہے کہ خدا سے لے کر اذان اور زبان سے مدرسہ تک اور ملبوسات سے ماکولات تک نفرتوں کی یہ آتش فشانی ۹/۱۱ اور ۲۰۱۴ء سے پہلے تک اتنی ہلاکت خیز کیوں نہ رہی؟ سرمایہ اور ذرائع ابلاغ کی ہوس زر گری نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس کے لیے ایک اصطلاح عالمی طور پر جس طرح رائج ہوئی۔ انسانی تاریخ بلکہ اس کی مذہبی تاریخ میں شاید ہی اس کی اور کوئی مثال ہو، ''اسلاموفوبیا'' کی اصطلاح گویا عالمی گفتگو کا سر عنوان بن گئی۔

***

دوسروں کے لیے اسلاموفوبیا کا لفظ خواہ کیسی ہی معنویت رکھتا ہو، اسلام والوں کے لیے اس میں کوئی جدت اور ندرت اس لیے نہیں ہے کہ وہ شرار بولہبی سے روز اول سے آشنا اور نبرد آزما رہے۔ لیکن اسلاموفوبیا کا بیج بونے والے اب خود اس شجر زقوم کے پھیلاؤ سے جس طرح عاجز ہیں وہ البتہ حیرت کی بات ہے، کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ اقوام متحدہ کا ادارہ اس اسلاموفوبیا کی مذمت کے لیے ایک دن خاص کرے گا۔ مگر یہ ہو کر رہا، اس سال ۱۵ مارچ کو پہلی بار اسلاموفوبیا سے مقابلہ کا بین الاقوامی دن کی شکل

میں خاص کیا گیا اور اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل انتونیو گوتریس نے بڑے صاف اور صریح لفظوں میں اعلان کیا کہ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور اسلاموفوبیا کے خلاف ہم سب کو کھڑے ہونا ہے، مسلم مخالف نفرت کے زہر کو ختم کرنے کے لیے یہ دن عملی قدم اٹھانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی یہ آواز خدا کرے ان کانوں تک پہنچے جن کو شاید خود خبر نہیں کہ تعصب اور اس سے کہیں زیادہ شوق تحکم نے کانوں پر کیسی کیسی مہریں لگا رکھی ہیں۔ فرد خاص کی سماعت وبصارت پر مہر لگ جانا بجائے خود بدبختی ہے لیکن اگر کسی تنظیم کی بنیاد ہی نفرت، عداوت، تعصب اور انصاف وانسان دشمنی پر ہو تو پھر دلوں پر پردوں کا پڑ جانا عذاب عظیم ہے۔ جب قلب اور سمع وبصر اپنے جوہر ہی سے محروم ہو جائیں تو پھر کہنے سننے کے عمل کے بے معنی ہونے میں کیا شک؟

***

ادھر ہندوستان میں وطن پرستی اور قوم پرستی، تہذیبی احیاء کے نام پر قدیم دور جاہلیت کے فرسودہ رواجوں کو جس طرح مزین کر کے پیش کیے جانے کا ماحول تیار کیا جا رہا ہے اور اس سعی بے سود کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، ایک طبقہ کی نظر میں اس کی وجہ اسلام کے بارے میں غلط فہمی اور آپسی مراسم میں فاصلوں کی دوری ہے۔ یہ سمجھ کر بعض اصحاب فکر ودانش نے اس قرآنی ہدایت کو یاد کیا کہ کلمۃ سواء سے روشنی حاصل کرتے ہوئے مکالمہ سے مصالحت کی راہ تلاش کی جائے، دانشوری کا یہ عمل لاکھ مستحسن سہی لیکن خرد کی تنگ دامانی ہی کہی جائے گی جب فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون کی حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ پھر یہ ان سے کیسے کہا جائے کہ ایسی بحثوں میں کیوں الجھتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں، فلم تحاجون فیما لیس لکم بہ علم۔

***

امت کے مسائل میں دانشوروں اور عوام کا فرق وفاصلہ کم ملحوظ رکھا گیا۔ ہمارے بعض دردمند خواص نے وقتاً فوقتاً اپنے احساسات کو لفظوں میں منتقل کیا تو یہی مضمون برآمد ہوا کہ امت کو خواص وعوام کے خانوں میں تقسیم کرنا المیہ ہے تو اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان دونوں میں فاصلے بڑھ گئے۔ قیادت کو ظاہر ہے خواص کی گرفت میں ہونا ہی تھا لیکن طبقاتی دوری نے قیادت کی اہمیت جس طرح ختم کی اور بحیثیت امت یا قوم الگ رہنے اور الگ چلنے کے گھن نے ہماری ذہنی قیادت کو جس طرح برباد کیا اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ رہنما یوسف بے کارواں ہو گئے اور کارواں والے کسی یوسف کی تلاش میں خود ہی بھٹک کر رہ گئے۔ نتیجہ میں صرف انتشار کا غبار رہ گیا۔ دانش حاضر کا موجودہ قومی المیہ بھی شاید اسی غبار راہ کا نتیجہ ہے۔ دانشور خدا کا شکر ہے تعداد میں کم نہیں، انفرادی خدمات بھی ان کی قدر کے قابل ہیں۔ کسی

جگہ دانشوری کے لیے مطلوب قدروں کی نشان دہی نظر سے گزری تھی۔اس میں سب سے پہلی شرط یہی تھی کہ اس کار خاص کے لیے ایک براق اور تجزیہ کار ذہن کی ضرورت کے ساتھ ایک ایسا دل بھی ضروری ہے جس کو دردمند کہا جاسکے۔دانشوری کی روایت کو توانا اور تنومند بنانے والوں کے لیے بتایا گیا کہ یہ وہ ہوتے ہیں جو زندگی کی گتھیوں کو حل کرنے کی لگاتار کوشش کرتے رہتے ہیں، مطالبہ ان کا وسیع تو ہوتا ہے لیکن وہ اپنے مشاہدے اور تجربے سے اس مطالعہ کو غذا پہنچاتے رہتے ہیں،ان کا علم نرا کتابی علم نہیں ہوتا،ان کا علم وہ ہوتا ہے جو رائے قائم کرنے، حکم لگانے اور فیصلہ کرنے کا شعور بخشتا ہے۔جن کی دانش ربانی بھی ہے اور نورانی بھی کہ مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ان کی عادت ہو جاتی ہے، جن کے ذہن اور فکر کے سرچشمے اوہام، رسوم، موروثی خیالات اور تعصبات سے آزاد رہ کر کسی مقدس عقیدہ کی پہاڑیوں پر تشنگی کے عالم میں ایڑیاں رگڑنے سے پھوٹتے ہیں۔ مقصد یہی ہوتا ہے کہ پیاس اور سیرابی کی حقیقتوں کو پالیا جائے۔دانش اگر اتنی جرأت مند نہیں کہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہار حق کر سکے اور پلک جھپکائے بغیر سچائی بیان کردے تو پھر اس دانش سے بےزاری کا اعلان کیوں نہ کردیا جائے۔دانشور تو وہی جو حق کی تلاش اور اس کے اعلان میں نہ تورورعایت کرے نہ مصلحت کا شکار ہو، اور کیا خوب کہا گیا کہ دانشور کے گرد نہ دھواں ہو نہ دھند لکا۔اور یہ کہ دانشوری چھوٹی چھوٹی وفاداریوں، وابستگیوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ کیا ایسے ذہن کو دانشور کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جس کی حد نظر بس شہر، ریاست یا وطن ہو یا جو سیاست کے دریا کا شناور ہو، سچ یہ ہے کہ دانشوری دوراندیشی کا دوسرا نام ہے۔جو نظر تاریخ کے اوراق سے بے نیاز ہو جو تحریکوں کے مدوجزر اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب اور اس کے ادراک سے بے تعلق ہو، وہ دانشور کی نظر نہیں ہو سکتی۔دانشوری کا طرۂ امتیاز آزاد انداز فکر اور مربوط نظام فکر کے سوا کچھ نہیں،ان خیالات کا اکتساب بلکہ اکتساب نور جس سے ملا وہ بھی کہتا ہے کہ دانشور کے لیے ایک شے اور درکار ہے جس کے بغیر کوئی فکر پیشہ انسان دانشور نہیں ہو سکتا۔یہ شے ذہانت ہے،اور اسی شے کی کمی آج شاید سب سے زیادہ ہے۔روایت، مروت، طرفداری اور گروہ بندی کے شوق بے مہار نے اس شے کو کہیں گم کر رکھا ہے اور یہ جملہ بھی آج پڑھنے اور سنانے کے لیے فائدہ سے خالی نہیں کہ وہ شخص جس کا مزاج سازشی اور جانب دارانہ ہو وہ آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے، لیکن وہ دانشور نہیں بن سکتا۔ ملک کی موجودہ صورت حال اور اس کے پس منظر میں صحافتی دانشوری کے بنتے بگڑتے رنگوں اور عکسوں کا نظارہ کرنے کے لیے ہدایت نامہ دانشوری کی یہ چند سطریں خدا کرے بار خاطر نہ بن جائیں۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ کی قرآن فہمی

پروفیسر ڈاکٹر محمد انس حسان

گورنمنٹ ملت پوسٹ گریجویٹ کالج ممتاز آباد، ملتان

anskashmiri@gmail.com

شاہ رفیع الدین کی ولادت ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز سے عمر میں چھوٹے تھے اور والد کی وفات کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی۔ تحصیل علم زیادہ تر شاہ عبدالعزیز اور شیخ محمد عاشق پھلتی سے کی۔ سر سید احمد خان (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء) نے لکھا ہے کہ تحصیل علوم عموماً اور سند حدیث نبوی خصوصاً اپنے والد ماجد کی خدمت میں لی۔[1] تاہم یہ بات درست قرار نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے کہ خانوادہ ولی اللہی سے متعلق چند مستند مآخذ میں سے ایک ''مقالات طریقت'' کی ایک روایت کے مطابق والد کی وفات کے وقت آپ ''میبذی'' پڑھتے تھے۔[2] سلوک و تصوف کے مراحل شیخ محمد عاشق پھلتی کے زیر سایہ طے کیے۔ بالآخر اپنی فطری استعداد اور صلاحیتوں کی بنا پر محض پندرہ برس کی عمر میں درس و تدریس سے منسلک ہوگئے۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز اپنے ایک مکتوب میں جو انہوں نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء کو شاہ ابو سعید رائے بریلوی کے نام بھیجا، تحریر فرماتے ہیں:

> رفیع الدین بفضل الٰہی تحصیل علوم سے فارغ ہوگئے ہیں۔ ایک درس کی مجلس میں علماء اور درویشوں کا ہجوم تھا، دستار تبرک باندھ کر ان کو درس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ الحمد للہ بہت سے افراد ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔[3]

یہ مکتوب ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں لکھا گیا، جس کا مطلب ہے کہ اس وقت آپ کی عمر محض پندرہ یا سولہ

---

[1] سر سید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی (مرتب: قاضی احمد میاں جوناگڑھی)، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۹

[2] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت (تحقیق و تعلیق: محمد اقبال مجددی)، پروگریسو بکس، لاہور، ۲۰۱۷ء ص ۶۷

[3] برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۴ء ص ۱۵۷

سال تھی۔ شاہ عبدالعزیز کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز کبر سنی، ضعف مزاج اور ہجوم عوارض کا شکار ہوئے تو ان کو اپنا جانشین بنایا اور مدرسہ رحیمیہ کی صدارت و اہتمام ان کے سپرد کی۔ شاہ عبدالعزیز نے شیخ احمد بن محمد شیر وانی کو شاہ رفیع الدین کے متعلق لکھا ہے:

اب برادر یگانہ اور خلیق زمانہ کا وقت ہے، جو نسبتاً میرے حقیقی بھائی ہیں اور فنون علم و ادب میں (جن کا لوگ مجھ سے انتساب کرتے ہیں) میرے شریک ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہیں مگر فن و حکمت میں میرے برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ان کی پرورش میرے ہاتھوں کی اور ان کی تکمیل کا مجھے ذریعہ بنا کر مجھ پر احسان کیا۔[۴]

دیگر اوصاف و کمالات کے ساتھ ساتھ وہ عمدہ حافظے کے مالک تھے۔ عبدالرحیم ضیاء کے بقول ان کو شعرائے جاہلیت کے نو سو طویل قصائد یاد تھے۔[۵] علم ریاضی اور علم فلکیات میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ بقول شاہ عبدالعزیز، مولوی رفیع الدین نے ریاضیات میں اس قدر ترقی کی جتنی اس فن کے موجد نے کی ہوگی۔[۶] فن ریاضی میں ''رسالہ اسطر لاب'' ان کی مہارت پر شاہد ہے۔ فلکیات کے موضوع پر ''رسالہ سوالات وجوابات متفرقہ'' میں بہت قیمتی معلومات ہیں۔ فلسفہ و عقلیات کے حوالے سے ان کی کتاب ''تکمیل الاذہان'' ہے، جس میں انہوں نے حصول علم کے تین طریقوں یعنی عقلی، نقلی اور کشف و وجدان پر بحث کی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک ان تینوں ذرائع علم کی جامعیت ہی سے ترکیبی رویہ سامنے آسکتا ہے۔ فقہ کے حوالے سے ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ شاہ رفیع الدین'' کے نام سے متداول ہے۔ جس سے برصغیر کے سماجی مسائل کے متعلق بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔ علمی لحاظ سے یہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ سے کسی طور کم درجہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ قرآن کریم کے حوالے سے ترجمہ قرآن و تفسیر رفیعی کے علاوہ نظم قرآنی پر ایک رسالہ ''تحقیق آیات قرآت'' اور ''تفسیر آیت النور'' شاہ صاحب کا علمی کام ہے۔ ڈاکٹر ثریا ڈار نے الیانع الجنی، حدائق الحنفیہ، ابجد العلوم اور نزہتہ الخواطر کے حوالے سے ان کی ۳۷ کتب کی فہرست دی ہے۔[۷] ان کی بعض کتابیں مولانا عبدالحمید سواتی نے

---

[۴] ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ب۔ت۔، ج ۵، ص ۳۸۲

[۵] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت، ص ۶۸

[۶] دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ملفوظات، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۱۳۱۱ھ، ص ۴۰

[۷] ثریا ڈار، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۲۰۰۹ء،

شائع کی تھیں لیکن مذکورہ ان تمام کتابوں اور رسائل کو تحقیق و تعلیق کے ساتھ طبع کرانے اور شاہ صاحب کی شخصیت اور علمی خدمات پر پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی کام کی بھی ضرورت ہے۔

شاہ صاحب کی وفات کے متعلق تذکرہ نگاروں میں قدرے اختلاف ہے۔[۸] تاہم اکثر محققین کے مطابق ان کی وفات ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں ستر سال کی عمر میں ہوئی۔ تلامذہ میں شاہ مخصوص اللہ، شاہ ابو سعید مجددی، مولوی آل حسن قنوجی، مولوی حسین احمد اور مولانا اسید الدین دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔ اخلاف میں ایک صاحب زادی امتہ اللہ اور چھ صاحب زادے مولوی محمد علی، مولوی محمد مصطفیٰ، مولوی مخصوص اللہ، مولوی محمد حسین، مولوی محمد موسیٰ اور مولوی محمد حسن یادگار چھوڑے ہیں۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے تراجم قرآن* میں سے کس ترجمہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اس سلسلے میں محققین مختلف الآراء ہیں۔ لیکن درست یہ ہے کہ قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ سب سے پہلے شاہ عبدالقادر نے اور تحت اللفظ ترجمہ سب سے پہلے شاہ رفیع الدین نے کیا۔ عبدالرحیم ضیاء نے لکھا ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا مگر ناتمام رہا اور دوسروں نے تمام کر کے ان کے نام سے شہرت دی۔[۹] ایوب قادری مرحوم کی بھی رائے یہی ہے کہ واقعی اس ترجمہ کے محرک

ص ۱۴۵-۱۴۹

[۸] ان کا سن وفات مولوی رحمٰن علی نے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء لکھا ہے (ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے ہند، ص ٦٦)/ مولوی فقیر محمد جہلمی نے سن وفات ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء رقم کیا ہے (ملاحظہ ہو: حدائق الحنفیہ، ص 470-۴۷) تاہم یہ دونوں سنین درست نہیں۔ دارالحکومت دہلی، نزہۃ الخواطر، مقالات طریقت اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان جیسے مستند مآخذ میں آپ کا سن وفات ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء درج ہے۔

* یہ بحث بہت قدیم ہے کہ شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدین میں پہلے کس نے قرآن کا ترجمہ کیا؟ اس پر محمد نعیم فلاحی کا ایک محققانہ مضمون معارف اگست ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں اس مسئلہ پر عمدہ بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے سب سے پہلے قرآن کا اردو ترجمہ کیا۔ مقالہ نگار نے بامحاورہ اور تحت اللفظ ترجموں میں تقسیم کر کے دونوں مترجمین کے سروں پر اولیت کا تاج رکھ دیا ہے (ک۔ ص۔ اصلاحی)

[۹] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت، ص ٦٩۔ مولانا نورالحق علوی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ شاہ رفیع الدین نے چند سورتوں کا ترجمہ کیا تھا، بعد ازاں مولانا عبدالحئی دہلوی (داماد شاہ عبدالعزیز) نے اسے مکمل کیا (ملاحظہ ہو: قاسمی، اخلاق حسین، محاسن موضح قرآن، ایچ۔ ایم سعید کمپنی، کراچی، ب۔ت۔ ص ٦١)

مذکور نے اسے بعد میں مرتب کیا اور پھر اس ترجمہ کے تفسیری فوائد انہوں نے تفسیر رفیعی کے نام سے الگ بھی شائع کیے۔[۱۰] ان تمام شواہد سے یہی پتہ چلتا ہے کہ موجودہ ترجمہ شاہ صاحب نے شروع ضرور کیا تھا۔ مگر مکمل نہ کرسکے تھے اور بعد میں ان کے شاگرد سید نجف علی خان نے مکمل کیا۔ لیکن اس سلسلے میں سید نجف علی خان کے فرزند سید عبدالرزاق نے تفسیر رفیعی کے دیباچہ میں لکھا ہے:

والد بزرگوار نے بخدمت مولوی رفیع الدین رحمہ اللہ کے عرض کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ترجمہ کلام اللہ تحت لفظی آپ سے پڑھ کر زبان اردو میں لکھوں۔ پھر آپ ملاحظہ فرما کر اصلاح دے کر درست فرمادیا کریں۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمایا اور تمام کلام اللہ اسی طرح مرتب ہوا۔ اور رواج پایا۔ اس صورت سے تفسیر سورہ بقرہ کے بطور فائدوں کے تمام وکمال مفصل ومشرح لکھی تھی اور موسوم بہ تفسیر رفیعی کیا۔[۱۱]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ ترجمہ سید نجف علی خان (والد سید عبدالرزاق) کی خواہش پر کیا گیا۔ یہ ترجمہ تحت اللفظ اور املائی ہے۔ شاہ رفیع الدین نے اس املائی ترجمہ کی اصلاح کی ہے۔

اسی طرز پر سورۃ البقرہ کے تفسیری فوائد بھی لکھے گئے، جو تفسیر رفیعی کے نام سے موسوم ہوئے۔ گویا شاہ رفیع الدین کا یہ کام بھی فتح العزیز کے طرز پر ہوا۔ لیکن ان تمام شواہد سے کسی طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ شاہ صاحب نے نامکمل کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ کا یہ کام شاہ صاحب نے شروع کیا مگر بوجوہ اس میں انقطاع آیا۔ اس انقطاع کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی اطلاع پر انہوں نے ترجمہ کا ارادہ ترک فرمادیا ہو۔ لیکن پھر اپنے شاگرد عزیز سید نجف علی خان کی خواہش پر باقی ترجمہ اور سورۃ البقرہ کی تفسیر املاء کروائی۔ اس توجیہ سے دونوں ترجموں کی تقدیم وتاخیر اور تکمیل کے حوالے سے پائے جانے والے جملہ شبہات کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اردو تراجم نے برصغیر میں بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایک دور تھا کہ مسلم گھرانوں میں قرآن کریم کی صرف تلاوت کی جاتی تھی۔ اس کو سمجھنے کا رواج بہت کم تھا۔ لیکن ان تراجم نے دعوت واصلاح کا ایسا کام سرانجام دیا جو حقیقی معنوں میں ان کے والد شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر اور ان کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ اسی بنا پر سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

---

[۱۰] قادری، محمد ایوب، اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۰ء، ص ۵۹-۷۲
[۱۱] دہلوی، شاہ رفیع الدین، تفسیر رفیعی، مطبع نقشبندی، دہلی، ۱۲۷۲ھ، ص ۱

یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ اس کے پڑھنے کا ایسا رواج ہوا جس کی مثال کسی دوسری دینی کتاب کے بارے میں نہیں مل سکتی۔ جہاں تک اصلاح عقائد اور عقیدہ توحید کی اشاعت کا تعلق ہے ان دونوں ترجموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد بیان نہیں کی جاسکتی کہ وہ لاکھوں سے متجاوز ہوگی۔[۱۲]

ڈاکٹر سید از کیا ہاشمی لکھتے ہیں:

یہ اردو زبان کا پہلا ترجمہ قرآن ہے جس نے قرآن فہمی کے بند دروازے کھول کر قرآن مجید کے اردو تراجم کی ایسی روایت قائم کی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔[۱۳]

بعض محققین نے شاہ رفیع الدین کے ترجمہ قرآن کو بچگانہ کاوش قرار دیا ہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ شاہ صاحب کا تحت اللفظ ترجمہ دراصل ان کے والد کے اس خیال کے تحت لکھا گیا تھا کہ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صالحہ لکھتی ہیں:

حقیقت میں شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بچگانہ نہیں بلکہ ایک بہت اعلیٰ مقصد کی ابتدا ہے۔ ان کا ترجمہ عوام کے لیے اس قدر مفید نہیں ہے۔ ہندوستان کے اکثر تعلیم یافتہ لوگ بھی عربی زبان میں کما حقہ علمیت نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کو اگر قرآن کے مضمون اور لسانی محاسن پر غور کرنا ہو تو ان کے لیے شاہ رفیع الدین کے ترجمے سے بہتر ترجمہ کوئی نہیں۔[۱۴]

شاہ رفیع الدین نے اپنے ترجمہ قرآن میں متن قرآن کی حد درجہ پابندی کی ہے۔ تحت اللفظ ترجمہ میں محاورہ یا کسی لفظ کے اضافے کی کوشش نہیں کی اور متن قرآن سے ادھر ادھر نہیں ہوئے۔ مگر اس التزام کے باوجود مکمل ترجمہ میں بہت کم الفاظ ایسے ملیں گے جو عام فہم نہ ہوں۔ وہ الفاظ جو آج نامانوس یا متروک ہوگئے ہیں، اس دور میں مروج تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو شاہ رفیع الدین کا یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے زیادہ مشکل تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اردو اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اتنے وسیع ذخیرہ الفاظ کی حامل نہیں تھی کہ اس میں تحت اللفظ ترجمہ کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ترجمہ کی اہمیت کا درست اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب اٹھارویں صدی کے سماجی، مذہبی اور لسانی تناظر میں اسے دیکھا جائے۔

---

[۱۲] ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۵، ص ۱۴۹

[۱۳] محمد خالد مسعود (مرتب) اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۳۷۱

[۱۴] صالحہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص ۱۹۶

شاہ رفیع الدین نے محض قرآن کریم کا اردو ترجمہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ تفسیری فوائد بھی املاء کروائے تھے۔ بد قسمتی سے یہ کام سورۃ البقرہ تک محدود رہا۔ معلوم نہیں یہ کام کیوں مکمل نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر سید از کیا ہاشمی کے مطابق:

> یہ تفسیر عام فہم اردو میں صرف سورۃ البقرہ کے مضامین کی وضاحت کرتی ہے، اس میں ہر آیت کے ترجمے کے بعد اس کے مطالب و معانی بامحاورہ زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ ترجمے کے بر عکس تفسیر کا اسلوب خطیبانہ ہے۔ قرآن مجید کے غوامض اور دقیق حقائق عام بول چال کی زبان میں اسی طرح بیان کر دیے گئے ہیں کہ عوام وخواص اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔[۱۵]

ذیل میں تفسیر رفیعی کے بعض محاسن پر نکات پیش کیے جاتے ہیں:

تفسیر رفیعی نامکمل سہی لیکن جو کچھ میسر ہے اسی سے شاہ صاحب کی رفعت علمی ظاہر ہوتی ہے۔ حروف مقطعات کے ضمن میں شاہ صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ ان کا حقیقی علم صرف اللہ تعالی کو ہے۔ مگر اس کے ساتھ انہوں نے بعض اقوال بھی نقل کیے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں: ''اور لوگ کچھ مناسبت سے کہتے ہیں جیسے اللہ تعالی کی نعمتیں، جن کے سرے پر یہی حروف آئیں۔ جیسے الف انعام اللہ کا اور لام لطف اس کا اور میم ملک اس کا، یا اللہ نے جبرئیل کے ہاتھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن بھیجا''۔[۱۶]

سبب نزول کے اعتبار سے شاہ صاحب اپنے والد ماجد کے اصول پر خصوص کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ: ''اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ''[۱۷] کے متعلق مفسرین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ اس آیت میں کفار سے مراد ابو جہل وابو لہب ہیں لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کفار جن کا ذکر اس آیت میں ہے، ان کا علم اللہ تعالی کو ہے بندوں کو نہیں۔[۱۸] گویا قرآنی آیت کے معانی کو محدود کرنے کی بجائے وسعت دے دی۔

نظم قرآن کے حوالے سے شاہ صاحب نے بہت اہتمام کیا ہے۔ وہ اپنے والد ماجد کے بر عکس قرآنی سورتوں اور آیتوں میں نظم و ربط کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق سورۃ البقرہ کی

---

[۱۵] محمد خالد مسعود (مرتب)، اٹھارہویں صدی عیسوی میں بر صغیر میں اسلامی فکر کے رہنما، ص ۳۷۴

[۱۶] دہلوی، شاہ رفیع الدین، تفسیر رفیعی، ص ۵

[۱۷] سورۃ البقرہ، آیت: ۶

[۱۸] دہلوی، شاہ رفیع الدین، تفسیر رفیعی، ص ۶

آیت ۱۲۴ سے ۱۶۲ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت اور دعا کا ذکر ہے جس کا ثمرہ آنحضرت ﷺ کا وجود گرامی ہے۔[۱۹] اسی طرح آیت ۱۶۳ سے ۱۶۸ تک کے مضامین میں ربط قائم کرتے ہوئے نہایت لطیف پیرائے میں بہت گہری بات کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''یہاں سے بیان ہے کہ جس طرح عبادت میں خدا کو لاشریک سمجھے، حرام اور حلال کے بھی حکم کرنے میں اسی کو لاشریک سمجھے''۔[۲۰] بعد ازاں آیت الکرسی کے بعد مذکور تین واقعات کو ''الحیّ القیوم'' کی تفسیر و شرح قرار دیا ہے۔[۲۱]

ناسخ و منسوخ پر بھی شاہ صاحب نے عمدہ بحث کی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت: ''وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً''[۲۲] کے حوالے سے مفسرین کا ماننا ہے کہ یہ حکم اول تھا اور جب عورت کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کردی گئی اور آیت میراث بھی نازل ہو چکی تو اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن شاہ صاحب اس آیت کے نسخ سے انکار کرتے ہیں اور اس ضمن میں ایسی عمدہ توجیہ کی ہے جو اس سے قبل کسی مفسر نے نہیں کی۔ وہ لکھتے ہیں: ''اس میں حکم عدت کا عورتوں کو نہیں ہے بلکہ حکم خاوندوں کو ہے کہ وصیت کریں گھر سے نہ نکال دینے کا، نہ عورتوں کو نکاح سے منع کرنے کا بلکہ فرما دیا ہے کہ اگر واسطے نکاح کے چلی جاویں تو مختار ہیں''۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، ساتھ اس حدیث کے کہ ''لاوصیۃ لوارث'' یہ بات بھی بے تحقیق ہے، اس واسطے کہ وصیت جو وارث کو نہیں وصیت تملیک ہے، یہ کہ اس کا حق کم زیادہ نہ کر ڈالیں، یہ وصیت تملیک کی نہیں ہے بلکہ اباحت عاریت کی ہے۔[۲۳]

بہر حال تفسیر رفیعی کے یہ حواشی بہت عمدہ اور تحقیقی ہیں۔ ان حواشی کے بغیر قرآن کریم کے ولی اللٰہی اسلوب کو سمجھنا دشوار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تفسیر کو از سر نو مرتب کیا جائے اور تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا جائے۔ یہ کام بلاشبہ پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی مقالے کا موضوع بن سکتا ہے۔ تفسیر رفیعی کے علاوہ شاہ رفیع الدین نے تفسیر آیت النور کے نام سے ایک مختصر رسالہ بھی لکھا ہے۔ یہ

---

[۱۹] ماخذ سابق، ص ٦٦

[۲۰] ماخذ سابق، ص ۹۱

[۲۱] ماخذ سابق، ص ١٦٥

[۲۲] سورۃ البقرہ، آیت ۲۴۰

[۲۳] دہلوی، شاہ رفیع الدین، تفسیر رفیعی، ص ۱۴۹

دراصل سورۃ النور کے رکوع 4 کی تفسیر ہے جس میں شاہ صاحب نے اپنے دور تک رائج مناہج تفاسیر کے بعد اپنے والد ماجد کا منہج بیان کیا ہے۔ مولانا عبدالحمید سواتی نے اس رسالہ کو شاہ ولی اللہ کی کتاب سطعات (جس میں عالم شہادت اور عالم مجرد کے درمیان ربط وارتباط سمجھایا ہے) کا تتمہ، تسہیل اور تشریح قرار دیا ہے۔[۲۴] مولانا عبدالحمید سواتی نے اس رسالے کو مولانا عبدالتواب ملتانی اور مجلس علمی (کراچی) کے قلمی نسخوں کی مدد سے نہایت محنت سے مرتب کیا ہے اور بعد ازاں اس کا عمدہ اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کا ایک اور رسالہ ''حملۃ العرش'' کے عنوان سے ہے، جس میں آپ نے قرآنی آیت: ''وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ''[۲۵] کی عمدہ تفسیر کی ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ''فتح العزیز'' میں اس رسالے کا بیشتر حصہ شامل کر لیا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق بڑے بلند القاب تحریر کیے ہیں۔[۲۶] اس رسالے کو بھی مولانا عبدالحمید سواتی نے نہایت محنت سے مرتب کر کے طبع کرایا ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کے تین قلمی نسخے رضا لائبریری (رام پور) کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان تینوں قلمی نسخوں میں متعدد مقامات پر لفظی اختلاف ہے۔ ان میں ایک محض پندرہ پاروں کا ترجمہ ہے جبکہ باقی دو مکمل ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ جب کہ اس کی پہلی اشاعت مطبع اسلامی (کلکتہ) سے ہوئی۔ پہلی جلد ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۸ء اور دوسری جلد ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں طبع ہوئی۔ بعد ازاں یہ مطبع ہاشمی (میرٹھ)، مطبع مصطفائی (کانپور)، مطبع مجتبائی (دہلی) سے بھی طبع ہوا۔ آج کل اس کا متداول ایڈیشن تاج کمپنی (لاہور) کا ہے جو عام طور پر دستیاب ہے۔ ترجمۂ شاہ رفیع الدین کے قلیل قلمی نسخوں کی موجودگی کے حوالے سے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے اعتراض کیا ہے کہ یہ ترجمہ شاہ رفیع الدین سے منسوب کیا گیا ہے۔ نیز تفسیر رفیعی بھی آپ سے منسوب کی گئی ہے۔[۲۷]

---

[۲۴] دہلوی، شاہ رفیع الدین، تفسیر آیت النور (مرتب: عبدالحمید سواتی)، مدرسہ نصرت العلوم، گوجرانوالہ، ۱۳۸۲ھ، ص ۹

[۲۵] سورۃ الحاقہ، آیت: ۱۷

[۲۶] دہلوی، شاہ عبدالعزیز، فتح العزیز (پارہ: ۲۹)، مطبع کانشی رام، لاہور، ص ۸۰

[۲۷] شاہ رفیع الدین کے ترجمہ قرآن کے حوالے سے مولانا کاندھلوی کے بعض اعتراضات درست جبکہ بعض بالکل درست نہیں ہیں۔ ہم اس کا انتساب شاہ صاحب سے اس لیے درست مانتے ہیں کہ امت کے بڑے طبقے نے اس انتساب کو درست قرار دیا ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح تفسیر رفیعی کے حوالے سے مولانا کے اعتراضات کی حقیقت تب تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک تفسیر رفیعی (مطبوعہ نقشبندی) کا تقابل، شاہ صاحب کے تحریر کردہ سورۃ البقرہ کے فارسی حواشی کے ان قلمی نسخوں سے نہیں کر لیا جاتا جو پنجاب

تفصیل کا موقع نہیں لیکن مولانا کا یہ مضمون اس حوالے سے کئی نئے پہلو غور و فکر کے اجاگر کرتا ہے۔[۲۸]

شاہ رفیع الدین دہلوی کے علاوہ خانوادہ ولی اللٰہی کی قرآن فہمی سے متعلق بعض کام ایسے بھی ہیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ یہاں ان کا مجملاً تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے سگے بھائی شاہ اہل اللہ (م:۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء) نے بھی قرآن کریم کی عربی زبان میں تفسیر لکھی تھی۔ اس تفسیر کے دو قلمی نسخے عربی/فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ٹونک) کے کتب خانے میں کتب خانہ نمبر:۱۹۸۱ اور ۲/۱۳۲ کے تحت موجود ہیں۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کے سمدھی اور شاہ عبدالعزیز کے ماموں شاہ محمد عاشق پھلتی (م:۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء) نے ''کشف الحجاب عن رموز فاتحۃ الکتاب'' کے نام سے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر لکھی تھی۔ یہ تفسیر غیر مطبوع ہے لیکن راقم کو تحقیق و تلاش کے نتیجے میں اس کے ایک قلمی نسخہ کا پتہ چلا ہے جو رضا لائبریری (رام پور) کے کتب خانے میں کتب خانہ نمبر:۴۳۵ کے تحت موجود ہے۔ یہ قلمی نسخہ بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ عربی/فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ٹونک) کے کتب خانے میں خانوادہ ولی اللٰہی کے ایک فرد مولوی عبدالحئی دہلوی (م:۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء) کی ''لغات القرآن'' کے تین قلمی نسخے موجود ہیں، جن کا کتب خانہ نمبر:۲۲۳۔۲۲۴۔۲۲۵ ہے۔ یہ اگرچہ طبع ہو چکا ہے لیکن اس کے قلمی نسخوں سے مصحح نسخہ بنانے کی ضرورت اب بھی ہے۔ قرآن فہمی کے حوالے سے خانوادہ ولی اللٰہی کی دیگر کتب میں بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

یونیورسٹی (لاہور) اور اسلامیہ کالج یونیورسٹی (پشاور) کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ امید ہے کہ کوئی محقق اس اہم کام پر متوجہ ہوگا۔

[۲۸] مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کا یہ مضمون ''ترجمہ قرآن ــــ موضح قرآن کا شاہ رفیع الدین سے انتساب'' کے عنوان سے فکر و نظر (اسلام آباد)، ج: ۴۲، شمارہ: ۲، ۲۰۰۴ء میں طبع ہوا تھا۔

ہندوستان میں تعددی معاشروں کا فروغ
(سندھ اور ملتان کی عرب حکومت کے حوالے سے)

ڈاکٹر محمد عمر فاروق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

mfarooque@jmi.ac.in

اسلام اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نہ صرف ایک الوہی مذہب ہے بلکہ دین فطرت بھی ہے اور انسانیت کے ساتھ ساتھ پورے کائنات کی بقاو بہبود کا ہر اصول اور طریقہ کار اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اسی وجہ سے خالق کائنات نے اپنے تمام انبیاء(آدمؑ سے لے کر محمدؐ تک) کو اسی دین کے ساتھ اس دنیا میں مبعوث فرمایا تاکہ ان کے اندر اختلاف و انتشار کی گنجائش کم سے کم ہو۔زمان و مکان کے اعتبار سے ان انبیاء کی شریعتیں مختلف رہیں، مگر سبھی انبیاء کا دین اپنی مبادیات کے اعتبار سے ایک ہی رہا۔ بالآخر اسی دین کا تکملہ نبی آخرالزماں محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہوا۔

کثرت میں وحدت کا یہ اصول اور نظریہ اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن کا بنیادی عنصر اور خاصہ رہا ہے، جس کی بوقلمونی اور کارفرمائی کا اظہار عہد وسطی کی مسلم تہذیب و ثقافت میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مسلم تاریخ میں تعددی ثقافت کے ظہور کے تعلق سے یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ بعثت محمدیؐ اور ہجرت مدینہ کے بعد دنیا کی معاشرتی تاریخ میں مخصوص اور مجرد (Exclusive) کے بجائے شمولیت پذیر (Inclusive) اور یک تمدنی (Monocultural) کے بجائے کثیر تمدنی (Polycultural) رجحانات اور عوامل پروان چڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم تاریخ میں تعددی روایت: دین فطرت ہونے کی وجہ سے تعددیت دین اسلام کا نہ صرف ایک اہم عنصر بلکہ لازمہ ہے۔اسی لیے تاریخ اسلام کے ابتدائی دور سے ہی مسلمانوں کا یہ طرۂ امتیاز نظر آتا ہے کہ انھوں نے "خذماصفاودع ماکدر" اور "الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ" کے اصول کو اپناتے ہوئے دوسری تہذیبوں اور معاشروں کی پسندیدہ اور مفید خصوصیات کو اخذ کرنے میں ہمیشہ فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔اس اخذ و استفادے کی مثالیں تاریخ اسلام میں بھری پڑی ہیں، جن کا دائرہ عبادات سے لے کر رسوم و رواج اور

روزمرہ کی زندگی تک وسیع ہے۔

اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ مرکب اور تعددی معاشرے میں بودوباش مسلم معاشرے کے مزاج کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہی۔ مسلمانوں نے نہ صرف مختلف تہذیبوں کے تئیں رواداری کا ثبوت پیش کیا بل کہ ان کی نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے تحفظ اور بہبود کے لیے مثبت اقدامات بھی کیے۔ مدینہ کا ابتدائی اسلامی معاشرہ مختلف النوع نسلی (عربی، فارسی و افریقی) اور مذہبی (مسلمان، عیسائی ویہودی) گروہوں کا مرکب تھا۔ اصولی طور پر ہر فرد کو فکری آزادی حاصل تھی اور کوئی بھی شخص تبدیلی مذہب پر مجبور نہ تھا۔[۱] مسلم تاریخ کے بعد کے ادوار یعنی عہد خلافت راشدہ، عہد بنوامیہ اور بنوعباس میں بھی فکری آزادی اور مذہبی و ثقافتی تنوع مسلم نظام سیاست کی اہم خصوصیت رہا ہے۔ مسلم دور حکومت کے ایک درخشاں عہد یعنی مسلم اسپینی تہذیبی و ثقافتی تاریخ کی عظمت کا سب سے اہم اور مثالی حصہ عرب حکمرانی کے تحت مسلم، عیسائی اور یہودی گروہوں کی آپسی ہم آہنگی اور پرامن بقائے باہم میں موجود ہے۔[۲] اسی طرح سلطنت عثمانیہ میں نظام ملت کے تحت مغربی ایشیا، یورپ اور شمالی افریقہ میں تعددیت کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ مسلم حکومت یعنی سلطنت عثمانیہ میں قیام کرنے والے تمام افراد کو جان ومال اور عزت و آبرو کی ضمانت گئی۔ مکمل آزادی کے ساتھ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنے مذہبی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت گئی۔ اس عہد میں بلقان ریاستیں، یونانی آرتھوڈوکس، آرمینیائی، گریگوری اور یہودی نہ صرف مذہبی بلکہ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بھی خود مختار تھے۔[۳]

ہندوستان (سندھ اور ملتان کی عرب حکومت) میں تعددی روایتوں کا فروغ: تاریخی روایتوں سے اس بات کے ثبوت ملتے ہیں کہ ہندوستانی سرزمین انسانیت کا اولین مامن و مسکن رہی ہے۔ یعنی سب سے

---

[۱] ۔ لیوی، ریوبن: اسلامی سماج، اردو ترجمہ: مشیر الحق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی، اشاعت دوم، ۲۰۰۱، ص: ۱۵

Lapidus, Ira M: A history of Islamic Societies, Cambridge University Press, Cambridge, Second Edition, 2002, P 23-24

[۲] ۔Burckhardt, Titus: *Moorish Culture in Spain*, translated in English by Alisa Jaffa, Allen & Unwin Ltd, London, 1972, P 23

[۳] ۔EbubekirCeylan: 'The Millet System in the Ottoman Empire', in *New Millennium Perspectives in the Humanities,* (ed.) Judi Mary Upton-Ward, Istanbul, 2002, P 250-252

پہلے انسانی قدم اسی خطہ ارض پر پڑے، پھر یہیں سے دنیا کے دیگر خطوں میں انسانی آبادی کی توسیع عمل میں آئی۔ انسانی تاریخ کے بعد کے ادوار میں بھی اس ملک نے اپنی سرسبزی اور خوش حالی سے ہمیشہ لوگوں کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کیا، بلکہ اپنا اسیر بھی بنایا۔ مذہبی مبلغین ہوں یا تجار، فاتحین ہوں یا مختلف وجوہ سے دیگر علاقوں میں بے گھر ہونے والے لوگ، سب کے لیے اس سرزمین نے اپنا دامن کھولے رکھا اور پھر مختلف اکائیوں کو ملا کر ایک ایسی وحدت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئی، جس میں دنیا کی تمام مذہبی، ثقافتی اور لسانی روایتوں کے لیے عزت و احترام موجود ہے۔ ہندوستان کی اسی انفرادیت نے عالمی تاریخ میں ہمیشہ اسے ایک تعددی معاشرے اور ثقافت کے حامل ملک کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں اس بات کی بھی آگہی ہوتی ہے کہ اس کی یہ تعددیت دور جدید ہی کا ایک مظہر نہیں ہے بلکہ یہ اس کی قدیم روایت کا حصہ ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اگر ہندوستانی تعددی معاشرے اور ثقافت کا مطالعہ کیا جائے تو مختلف تاریخی شواہد سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی آمد کی ابتدا ہی سے علاقے کے عوام کے مذہبی و معاشرتی جذبات کا مکمل خیال رکھا۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں کا برتاؤ اخوت و محبت، یک جہتی، شمولیت پسندی، عدل و انصاف، رواداری اور ہمدردی پر مبنی رہا، جس نے ایک تعددی معاشرے و ثقافت کی تشکیل اور اس کی مضبوطی و پائیداری میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور پر برصغیر ہند میں قائم ہونے والی پہلی مسلم حکومت، جو دمشق کی خلافت بنوامیہ کے تحت سندھ اور ملتان کے علاقے میں قائم ہوئی، اس نے اپنی سیاسی و انتظامی پالیسیوں کے ذریعے تعددی معاشرے اور ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

ہندوستان میں مسلم اور غیر مسلم تعلقات کی تاریخ تقریباً بارہ صدیوں پر محیط ہے۔ جنوبی ہند کے ساحل پر مسلم تاجرین اور مبلغین کے ذریعے اس خطے میں اسلام کا داخلہ ہوا۔ یہ داخلہ نہایت پرامن اور سنجیدہ تھا۔ مسلم تاجروں نے مقامی راجاؤں کو اپنے اخلاق و کردار کا گرویدہ بنالیا۔ اس طرح ان عرب تاجروں کو مقامی لوگوں کی طرف سے عزت و احترام حاصل ہوا اور وہ مقامی آبادی میں گھل مل گئے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں محمد بن قاسم کی سندھ پر فتح اور تیسرے مرحلے میں وسط ایشیا کے ترکوں اور افغانوں کی فتوحات کے ذریعے بڑے پیمانے پر اسلام اور مسلمانوں کو برصغیر ہند میں قدم جمانے اور یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ ربط و تعامل کا موقع ملا۔ پہلے مرحلے میں ہندو مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت گرم جوش اور مودت پسندانہ رہی، لیکن

دوسرے اور تیسرے مرحلے کے بعد یہ نوعیت تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ اب انھیں ایک حملہ آور اور بیرونی حکم راں کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی مسلم طرز حکم رانی، مقامی باشندوں کے ساتھ حکم رانوں کا برتاؤ، معاشرتی تعامل، آپسی میل جول بالخصوص بین المذاہب شادیوں کے نتیجے میں ابتدا سے ہی اس نقطہ نظر میں نمایاں مثبت تبدیلی نظر آتی ہے، جسے ہند اسلامی تعددی معاشرے کی ابتدائی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم طرز حکم رانی کے ایک اہم اصول یعنی مقامی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال ساتھ ہی علاقائی رسوم و رواج، طرز زندگی اور معاشرتی ڈھانچے میں کم سے کم تبدیلی نے بھی ہندوستانی سرزمین پر قائم ہونے والی پہلی مسلم حکومت میں تعددی روایت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرز حکمرانی کا نتیجہ تھا کہ دیبل کی فتح کے بعد جب عرب افواج نے دوسرے علاقوں کی جانب پیش قدمی کی تو مفتوحین کے ساتھ مسلم حکومت کے حسن سلوک کو دیکھتے ہوئے مختلف قلعوں کے حکام اور علاقوں کے سربراہان نے عرب سپہ سالار محمد بن قاسم سے امان طلب کرنے اور اطاعت قبول کرنے کو ہی اپنے لیے بہتر سمجھا۔ ان حکام اور سربراہان کے ساتھ مسلم حکومت نے نہ صرف خوش خلقی اور اعلیٰ ظرفی کا برتاؤ کیا، بلکہ ان کے مقام و مرتبے کو برقرار رکھتے ہوئے انھیں خلعتیں عطا کیں، جسے سلطنت میں قیام کرنے والے تمام گروہوں کی سیاسی مشارکت و حصے داری اور مذہبی و معاشرتی تعددیت کی ایک عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاریخی حوالے ایسے حکام و سربراہان کی ایک لمبی فہرست پیش کرتے ہیں، جن میں قلعہ نیرون کے حاکم سندر عرف سمنی،[۴] بودھ سربراہ کاکا بن کوتل،[۵] اور موکا بن بسایہ، جسے علاقہ ''بیٹ'' کا حاکم مقرر کیا گیا،[۶] کے نام

---

[۴]۔ علی بن حامد کوفی: فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، مصحح، محقق و شارح: نبی بخش خاں بلوچ، مترجم: اختر رضوی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، سندھ، اشاعت سوم، ۲۰۰۸، ص: ۱۴۸؛ میر علی شیر قانع ٹھٹوی: تحفۃ الکرام، جلد سوم، تصحیح و حواشی: مخدوم امیر احمد اور نبی بخش خاں بلوچ، مترجم: اختر رضوی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، سندھ، اشاعت سوم، ۲۰۰۶، ص: ۲۸-۲۹ اور ۴۰۔

* اس کتاب کو، جو ''چچنامہ'' کے نام سے معروف ہے، محمد علی بن حامد بن ابو بکر کوفی نے تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔ انھوں نے اس کتاب کے عربی متن کو سندھ کے دارالسلطنت اروڑ/ارور/الور اور بکھر کے قاضی اسماعیل بن علی بن محمد بن موسیٰ بن طائی بن موسیٰ بن

خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔

حکومت میں معاشرے کے مختلف گروہوں اور طبقات کی حصہ داری کو یقینی بنانا اور اس پر ترجیحی بنیادوں پر عمل آوری کا ہی نتیجہ تھا کہ سندھ اور ملتان کی فتوحات کے دوران محمد بن قاسم نے انفرادی اور اجتماعی شکل میں سبھی کو امان دینے کی عمومی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کی وجہ سے حجاج بن یوسف نے اپنے مختلف خطوط کے ذریعے محمد بن قاسم کی نہ صرف تنبیہ کی، بلکہ اپنے ایک خط میں سخت قسم کے الفاظ بھی استعمال کیے۔[۷] سندھ اور ملتان کے علاقے میں اس عہد کی عرب طرز حکم رانی کی یہ خاصیت شمار کی جاسکتی ہے کہ علاقے کے تمام طبقات اور گروہوں کی شمولیت کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی تاکہ عام رعایا حکومت کی حریف نہ ہو کر اس کے حلیف کے طور پر کام کرے اور اس کے دل میں حکومت کے تعلق سے غیریت کا رجحان نہ پیدا ہو، بلکہ وہ اسے اپنی اور اپنے لوگوں کی حکومت تصور کرے۔ سندھ اور ملتان کی عرب حکومت میں مقامی آبادی کی شراکت اور حصے داری سے متعلق سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں کہ :

> عرب اس راز سے خوب واقف تھے کہ ملکی لوگوں کو جس قدر زیادہ خوش رکھا جائے گا، اسی قدر ان کی سلطنت کی جڑ مضبوط ہوگی۔ اسی لیے انھوں نے سندھیوں کو ہر طرح سے خوش رکھا۔ چناں چہ ابتدا ہی سے عربوں نے ان پر بھروسہ کرکے بڑے بڑے عہدے ان کے سپرد کیے۔[۸]

یعقوب بن طائی بن محمد بن موسیٰ بن شیبان بن عثمان ثقفی سے حاصل کیا تھا۔ موسیٰ بن یعقوب بن طائی بن محمد بن موسیٰ بن شیبان بن عثمان ثقفی کو محمد بن قاسم نے اروڑ کا قاضی اور خطیب مقرر کیا تھا۔

* قلعہ نیرون کوٹ کے حاکم کا نام زیادہ تر مصنفین نے ''سمنی'' لکھا ہے، مگر ''تحفۃ الکرام'' کی تصحیح کرنے اور حواشی لکھنے والوں نے ''فتح نامہ'' کے فارسی ایڈیشن کے حوالے سے لکھا ہے کہ حاکم قلعہ کا اصل نام ''سندر'' تھا، ساتھ ہی انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ ''سمنی'' کے معنی پروہت کے ہیں اور اس عہد میں بودھ مذہب کے پروہتوں کو ''سمنی'' کہا جاتا تھا۔ نیرون کوٹ کا والی بھی ایک پروہت تھا، اس وجہ سے بہت سے مصنفین کو اس سلسلے میں مغالطہ ہو گیا۔

[۵] فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۱۴۰-۱۴۱؛ میر علی شیر قانع ٹھٹوی: تحفۃ الکرام، ص: ۴۲-۴۳

[۶] فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۱۵۱؛ میر علی شیر قانع ٹھٹوی: تحفۃ الکرام، ص: ۴۶

[۷] فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۱۶۳-۱۶۴، ۱۷۵-۱۷۶، ۲۰۰، ۲۰۲ اور ۲۰۹-۲۱۰

[۸] سید سلیمان ندوی: تاریخ سندھ، دارالاشاعت، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۵، ص: ۳۷۷

مقامی آبادی کے صاحب علم و فضل اور صاحب صلاحیت واستعداد افراد کو امان دینے اور ان کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کی ایک اہم مثال راجہ داہر کے وزیر ''سیاکر'' کی شمار کی جاسکتی ہے۔ سندھ کے تقریباً تمام علاقوں کو فتح کرنے کے بعد جب محمد بن قاسم نے آس پاس کے بادشاہوں کے پاس خطوط لکھ کر انھیں اسلام کی دعوت دی اور ان سے اطاعت وفرماں برداری کا تقاضا کیا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے داہر کے وزیر ''سیاکر'' نے بھی محمد بن قاسم کے پاس اپنا ایک معتمد بھیج کر امان طلب کی اور مسلم حکمراں کی اطاعت قبول کرنے کا اظہار کیا۔ اپنے پیغام رساں کو بھیجنے کے بعد وہ خود بھی عرب سپہ سالار کے سامنے حاضر ہوا، ساتھ ہی اپنے ہم راہ ان مسلمان عورتوں کو بھی لایا، جو دیبل کی بندرگاہ سے پکڑ کر قید کرلی گئی تھیں اور بیان کے مطابق جنھوں نے حجاج کا نام لے کر فریاد کی تھی۔[9] محمد بن قاسم نے ''سیاکر'' کو نہ صرف امان دی، بلکہ اس کی عزت افزائی اور تعظیم کرتے ہوئے معزز لوگوں کو اس کے استقبال کے لیے بھیجا۔ اس سلسلے میں فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ:

> محمد بن قاسم نے اس کی عزت افزائی کے ساتھ اس پر بڑی مہربانیاں بھی کیں۔ وزارت کا فریضہ اس کے سپرد کیا۔ محمد بن قاسم کو جو بھی مشورہ یا راز کی بات کرنی ہوتی تھی، اس سے کرتا تھا اور اس کی رائے لیتا تھا۔ امور سلطنت، نظم ونسق اور حکومت کی سلامتی واستحکام کے سلسلے میں وہ امیر کو مفید مشورے دیا کرتا تھا۔ وہ امیر محمد بن قاسم سے کہتا کہ: یہ رائے یا تدبیر جو امیر عادل بیان کرتے ہیں، ہند کے سارے علاقوں کو قبضے میں لائے گی۔ حکومتی قوانین اور سلطنت کے مستقل عناصر جن پر اس کی تشکیل کی گئی ہے، بالآخر تمام دشمنوں کو مغلوب اور زیر کردیں گے۔ یہ رعایا اور معاونین کو سکون بخشیں گے، قوانین کی سختی سے اطاعت کو یقینی بنائیں گے، محصول میں اضافے کی کسی بھی ضرورت کو دور کریں گے اور دوستوں وماتحت افسران کو خوش رکھیں گے۔[10]

مذکورہ بالا واقعے سے صرف اس بات کا ہی اظہار نہیں ہوتا کہ ایک صاحب علم اور صاحب حیثیت کو امان دے کر سندھ اور ملتان کے عرب حکمراں نے رواداری اور ہم دردی کا ثبوت فراہم کیا، بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلم حکومت کے قیام سے پیش تر جو شخص، جس حیثیت اور مرتبے پر فائز تھا، اس کو اسی عہدے پر بحال کرنے کی بھی کوشش کی گئی تاکہ نہ صرف مقامی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ اور بہتر

---

[9]۔ محمد ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان، جلد اول، مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، بار سوم، ۱۹۱۵، ص: ۲۱۲

[10]۔ فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۲۰۲-۲۰۳

استعمال ہو سکے، بلکہ عام رعایا میں یہ پیغام بھی پہنچے کہ ان کے معزز اور صاحب حیثیت افراد کے ساتھ مسلم حکومت کا برتاؤ بہتر ہے اور یہ غیروں کی حکومت نہیں بلکہ ان کی اپنی ہی حکومت ہے، جس کے زیادہ تر عہدے دار مقامی افراد ہی ہیں۔ ساتھ ہی اس واقعے کے ذریعے سیاسی و انتظامی امور میں مقامی آبادی کی حصے داری اور حکومت کے عوامی و تعددی رجحان کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح سندھ میں پہلے سے حکمراں خاندان کے افراد کی اطاعت قبول کرنا اور انھیں حکومت میں شریک و سہیم بنانا بھی سندھ کی اس عرب حکومت کا خاصہ شمار کیا جاتا ہے۔ اپنے اس عمل کے ذریعے مسلم حکومت نے نہ صرف مقامی افراد اور امراء کو حکومت میں شراکت اور حصے داری عطا کی، بلکہ حکومت اور مقامی آبادی کے درمیان غیریت اور نامانوسیت کے تصور کا خاتمہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کی ایک اہم اور عمدہ مثال راجہ داہر کے چچازاد بھائی ککسا بن چندر ابن سیلائج کی شمار کی جاسکتی ہے۔ ''ککسا'' دریائے ''بیاس'' کے جنوب میں واقع ایک قدیم قلعہ ''بھاٹیہ'' پر حکمراں تھا اور داہر بن چچ بن سیلائج کے ساتھ عربوں کے خلاف جنگ میں اس نے بھی شرکت کی تھی۔ داہر کی شکست اور وفات کے بعد اس نے میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اس قلعہ میں پناہ لے لی تھی، مگر جب عرب افواج یہاں تک پہنچ گئیں تو اس نے پیشگی خراج اور ضمانت بھیج دی اور فوراً بعد محل کے سردار اور امراء نے بھی عرب سپہ سالار کے سامنے حاضر ہو کر اطاعت کا عہد کیا۔ محمد بن قاسم نے نہ صرف فراخی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا، بلکہ ان کی عزت و تکریم کرنے کے بعد عرب سپہ سالار نے ان سے کہا:

> ککسا اہل اروڑ میں سے ایک ہے، یہاں کے تمام افراد دانش مند اور صاحب علم و فضل ہیں۔ اپنی صداقت، دیانت داری، وفاشعاری اور ذہانت و فطانت کے لیے مشہور ہیں۔ اس لیے اسے امان دی جاتی ہے، تاکہ وہ ہمارے پاس پر امید اور باہمت ہو کر آئے۔ میں اسے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اپنا مشیر متعین کرتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ دیانت داری اور اپنے وزیر جیسا برتاؤ کروں گا۔[11]

تاریخ اور سیرت نگاروں نے ککسا کی علمی لیاقت اور دانش مندانہ صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے علاقہ سندھ کے دانش وروں میں سے ایک شمار کیا ہے اور محمد بن قاسم و ککسا کی قربت اور تعلقات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم زیادہ تر اسے اپنے پاس رکھتا اور اس سے صلاح و مشورہ کیا کرتا

---

[11]۔ فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۲۳۴

تھا۔ مختلف امور میں اس کے مشوروں کو اہمیت دیتا اور اکثر و بیشتر ان پر عمل بھی کرتا۔ عرب سپہ سالار نے اسے سارے امیروں اور سپہ سالاروں کا سربراہ متعین کیا تھا۔ پورے علاقے کا مالیاتی انتظام اس کی زیر نگرانی رہتا اور خزانہ بھی اس کی مہر کے حوالے کیا گیا تھا۔ محمد بن قاسم کی ماتحتی قبول کرنے کے بعد وہ ہر جنگ میں عرب سپہ سالار کا معاون رہا اور متعدد امور میں ککسا کے مشوروں کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہی اسے عرب حکم راں کے ذریعے ''مبارک مشیر'' کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔[۱۲]

سندھ اور ملتان کی عرب حکومت میں مقامی آبادی کی قدیم روایات اور ان کے رسوم و رواج کو برقرار رکھنے کی سب سے اہم اور عمدہ مثال لوہانہ کے جاٹوں کی ہے اور اسے تعددی ثقافت کو قبول کرنے کے تعلق سے ایک سنگ میل بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی حوالے اس بات کا بھی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اگرچہ لوہانہ کے جاٹوں کی وہ قدیمی روایات نہ صرف بہت زیادہ وحشیانہ تھیں، بلکہ کسی حد تک اسلامی تعلیمات سے متعارض بھی، مگر محمد بن قاسم نے ان میں دخل اندازی کو پسند نہیں کیا اور لوہانہ کے جاٹوں کو ان کی قدیم روایات پر برقرار رکھا گیا[۱۳]۔ اس سلسلے میں مسلم حکمراں کا یہ عمل بھی قابل تحسین گردانا جاسکتا ہے کہ اس نے لوہانہ کے ان جاٹوں کے سلسلے میں فیصلہ لینے سے پیش تر ان کی روایات اور دستور کو جاننے اور سمجھنے کی بھی کوشش کی، اس تعلق سے اس نے وزیر ''سیاکر'' اور ''بیٹ'' علاقے کے حاکم موکا بن بسایہ سے مشورہ بھی کیا تاکہ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔ تاریخی روایات کے مطابق وزیر سیاکر نے بتایا کہ:

> راجہ چچ کے زمانے میں لوہانہ کے جاٹوں کو ریشم اور مخمل کے نرم کپڑے پہننے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ نیچے اور اوپر کالی گدڑی پہنتے تھے، کھردری چادر کاندھوں پر ڈالتے تھے اور سر و پیر برہنہ رکھتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی نرم کپڑا پہنتا، تو اس پر جرمانہ کیا جاتا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت وہ کتے ساتھ لے کر چلتے تھے، جس کی وجہ سے دور سے پہچانے جاتے۔ ان کے کسی بھی بزرگ یا سربراہ کو گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں بھی مضافات میں بادشاہ یا حکمرانوں کو راہبر کی ضرورت ہوتی، وہ راستہ بتایا کرتے۔ راستوں کی نشان دہی اور مسافروں کو ایک

---

[۱۲]۔ ماخذ سابق، ص: ۲۳۴-۲۳۵

[۱۳]۔ سید صباح الدین عبدالرحمان: ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکم رانوں کی مذہبی رواداری، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹، جلد اول، ص:

قبیلے سے دوسرے قبیلے پہنچانا، ان کا پیشہ تھا۔ اگر ان کا کوئی سربراہ یا رانا گھوڑے پر سوار ہونا چاہتا، تو بغیر زین اور لگام کے گھوڑے کی پشت پر صرف ایک گدڑی رکھ کر سوار ہو سکتا تھا۔ دوران سفر اگر کسی مسافر کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو جاٹ قبیلے کو مدد اور بازپرس کے لیے بلایا جاتا، کیوں کہ یہ بھی ان کے سربراہوں کے فرائض میں شامل تھا۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی چور ثابت ہو جاتا، تو اسے عیال واطفال کے ہم راہ آگ کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ قافلے دن ورات ان کی رہبری میں سفر کیا کرتے تھے۔ ان میں چھوٹے بڑے اور اونچ نیچ کا کوئی امتیاز نہ کیا جاتا۔ یہ وحشی طبع قبائل تھے اور حکمرانوں کی اطاعت سے ہمیشہ سرکشی اور شاہ راہوں پر رہ زنی کیا کرتے تھے۔ دیبل میں بھی یہ لوگ وہاں کے باشندوں کے ساتھ لوٹ مار میں شریک رہا کرتے تھے۔ شاہی باورچی خانے کے لیے لکڑیوں اور رسد کی فراہمی، نیز بادشاہ کی اعانت اور اس کی حفاظت ان پر فرض تھی۔[۱۴]

ہندوستانی علاقوں میں فتوحات کے ساتھ ساتھ محمد بن قاسم نے حکومت کے انتظامی معاملات پر بھی توجہ صرف کی اور دمشق کی اموی خلافت کی ہدایات کے مطابق یہاں کا نظم ونسق قائم کیا۔ حکم راں کی حیثیت سے محمد بن قاسم نے بلا تفریق نسل ومذہب اپنی رعایا کے ساتھ، جس قسم کے اخلاق کریمانہ اور عدل وانصاف پروری کا مظاہرہ کیا وہ تاریخی حقائق کا حصہ بن چکے ہیں۔ سندھ کی مہم کے دوران عراق کے والی حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو مستقل تحریری ہدایات ارسال کیں، یہ تحریری ہدایات اکثر رعایا پروری اور ان کے جملہ حقوق کے تحفظ کی تلقین اور یاد دہانی سے پر ہوتیں۔ حجاج کی ان اولین تحریری ہدایات میں سے ایک کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

دیبل میں جو کچھ بچایا گیا ہے، اسے قلعہ میں ذخیرہ کر کے رکھنے کے بجائے عوام الناس پر صرف کرنا بہتر ہے۔ کیوں کہ ملک فتح ہونے اور قلعوں کے قبضہ میں آنے کے بعد رعایا کی بہبودی، ان کے آرام اور دل جوئی کی کوشش کرنی چاہیے۔ کاشت کاروں، صنعت کاروں، دست کاروں اور تاجروں کے لیے ہر قسم کی رعایت روا رکھو، اس لیے کہ ان کی مرفہ حالی سے ملک آباد وخوش حال رہتا ہے۔[۱۵]

مذکورہ بالا اقتباس مسلم حکم رانوں کی رعایا پروری کا صرف بین ثبوت ہی نہیں، بلکہ رعایا کی خوش حالی

---

[۱۴] ۔ فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۲۱۵-۲۱۶

[۱۵] ۔ ماخذ سابق، ص: ۱۳۴-۱۳۵

اور بہبودی کے تعلق سے حکومتی نقطہ نظر کا مظہر بھی ہے۔ ساتھ ہی اقتباس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلم حکومت اپنی تمام رعایا کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرتی تھی اور ان کے درمیان لسانی، نسلی اور مذہبی بنیادوں پر کوئی تفریق روا نہیں رکھتی تھی، کیوں کہ اقتباس میں عوام الناس کا عمومی لفظ استعمال ہوا ہے اور جس عہد کی بات ہے، اس وقت دیبل کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ اسی طرح سلطنت کے استحکام اور ملکی ترقی کا راز حکومت کے تعلق سے عوام الناس کے عمومی رویے اور رعایا کی انفرادی و اجتماعی خوش حالی میں مضمر سمجھا گیا ہے، اسی وجہ سے رعایا کی دل جوئی اور ان کی مرفہ حالی پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔

محمد بن قاسم نے سندھ، خاص طور پر برہمن آباد کی فتح کے بعد وہاں کے عوام کے لیے جو مشہور اعلامیہ جاری کیا تھا، جسے تاریخ میں برہمن آباد سمجھوتہ (Brahmanabad Sattlement) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[۱۶] اس سمجھوتے میں اس بات کا واضح تذکرہ تھا کہ جو لوگ مسلم حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اپنے مذہب پر باقی رہنا پسند کریں گے، انھیں نہ صرف اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، بلکہ مسلم حکومت ان کے حقوق کا تحفظ بھی کرے گی اور اس تعلق سے ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی یا زیادتی نہیں کی جائے گی۔[۱۷]

مذہبی تعددیت کی تشکیل، اس کے تحفظ، تعددی معاشرے کے فروغ اور مختلف مذاہب کے لوگوں کی حکومت میں حصہ داری کے تعلق سے برہمن آباد کے برہمن عوام کے سلسلے میں محمد بن قاسم کا وہ فرمان بھی بہت اہم شمار کیا جاسکتا ہے، جس کے ذریعہ نہ صرف برہمنوں کو مختلف عہدوں پر مامور کیا گیا، بل کہ ان سے علاقے کے صاحب علم اور حیثیت لوگوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، تاکہ ان کو انتظامی امور سے متعلق مختلف عہدوں پر تعینات کیا جاسکے۔ فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ:

> جس طرح راجا چچ کے زمانے میں ہر ایک برہمن کسی نہ کسی کام پر مامور ہوا کرتا تھا، محمد بن قاسم نے بھی انھیں کوئی نہ کوئی کام سونپ دیا۔ پھر محمد بن قاسم کے حکم پر تمام برہمنوں کو حاضر کیا گیا، جب سبھی اکٹھا ہو گئے، تو محمد بن قاسم نے ان سے کہا:

---

[۱۶]۔ Ikram, S M: History of Muslim civilization in India and Pakistan (A Political and Cultural history), Institute of Islamic Culture, Lahore, 13th Edition, 2015, p. 9-12

[۱۷]۔ فتح نامہ سندھ عرف چچنامہ، ص: ۲۱۰-۲۱۱

داہر نے تمھیں اہم کاموں پر مامور کیا تھا، جس کی وجہ سے تم شہر اور دیہات کے حالات سے بخوبی واقف ہوگے۔ چناں چہ تم جس مشہور و معروف شخص کو بھی تربیت اور نوازش کا مستحق سمجھتے ہو، اس سے ہمیں آگاہ کرو تاکہ اس کے حق میں مہربانی کی جائے اور اسے اعلیٰ انعامات سے سرفراز کیا جائے۔ چوں کہ ہمیں تمھاری ایمان داری اور صداقت پر پورا بھروسہ ہے، اس لیے تم اپنے عہدوں پر بحال کیے جاتے ہو۔ ملک کا سارا کاروبار تمھاری معاملہ فہمی پر چھوڑ دیا جائے گا اور یہ منصب تمھاری اولاد اور نسلوں سے کبھی نہ چھینا جائے گا۔[۱۸]

مذکورہ بالا اقتباس سے صرف اس بات کا ہی پتہ نہیں چلتا کہ محمد بن قاسم نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو سیاسی حصہ داری دیتے ہوئے تعددیت کی مثال قائم کی، بلکہ اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ معاملہ دوست و دشمن اور حاکم و محکوم کا نہیں ہے، اپنی رعایا کا ہے اور حکومت کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لیے رعایا میں سے جو شخص بھی سود مند ہو سکتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو بھرپور کام میں لایا جائے۔ اسی لیے برہمنوں کو نہ صرف ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کیا گیا، بلکہ ان کی معاملہ فہمی اور مشوروں کو بھی قابل اعتنا سمجھا گیا، ساتھ ہی سندھ و ملتان کی مسلم حکومت نے اپنے اس عمل کے ذریعہ مذہبی قائدین و پیشواؤں کی دیانت داری اور صداقت کی بھی توثیق کی۔

اسی طرح تعددیت کے حوالے سے برہمن آباد کے مشہور اور قدیم مندر کی آبادکاری کا وہ اقدام بھی بہت اہم شمار کیا جاسکتا ہے، جو اس وقت کی مسلم حکومت نے مندر کے پجاریوں کی درخواست پر اٹھایا تھا، اس اقدام کو مذہبی، معاشرتی اور معاشی تعددیت کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ عراقی اور شامی اہل علم سے اس مسئلے پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد حجاج بن یوسف نے مندر سے متعلق فیصلہ دیتے ہوئے محمد بن قاسم کو لکھا کہ :

۔۔۔ برہمن آباد کے ہندوؤں کی درخواست ہے کہ مندر کو آباد رکھنے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے۔ جب وہ لوگ ہماری اطاعت قبول کرکے جزیہ ادا کرتے ہیں، تو پھر ان کے مذہب یا خانگی معاملات میں دخل دینے کا ہمیں اختیار نہیں ہے۔ ان کی جان کی حفاظت

---

[۱۸]۔ ماخذ سابق، ص: ۲۱۲

ہمارا فرض ہے اور ان کے مال پر کوئی شخص دست درازی نہ کرے۔ کیوں کہ وہ سب ہماری حمایت اور پناہ میں ہیں۔[19]

تعددی ثقافت کے سلسلے میں بڑا ہی دلچسپ اور قابل تقلید واقعہ یہ بھی ہے کہ اس موقعے پر محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے شہریوں کو یہ نصیحت کی کہ وہ قدیم رسم کے مطابق برہمن پجاریوں کو نذرونیاز دینا جاری رکھیں۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی جاری کی کہ سندھ کی قدیم روایت کے مطابق محصول میں سے تین فیصد برہمن پجاریوں کے لیے علاحدہ رکھا جائے تاکہ بوقت ضرورت ان پر خرچ کیا جا سکے۔[20]

محمد بن قاسم نے سندھ کے غیر مسلم عوام کو مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشرتی و معاشی حقوق اور تحفظ بھی فراہم کیا۔ عوام الناس کے سامنے محمد بن قاسم نے یہ اعلان کیا کہ انھیں اپنے رسوم و رواج کی بجا آوری اور تہواروں کے اہتمام کی مکمل آزادی حاصل ہے۔[21] مزید وہاں کے لوگوں میں سے جو صاحب حیثیت اور اہل منصب تھے، ان کے عہدہ و منصب کو بحال رکھا گیا۔ ساتھ ہی ان کے معاملات میں ان کی معاشرتی حیثیت کی رعایت بھی کی گئی۔

اسی طرح سے معاشی حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں صرف برہمن آباد کے علاقے میں محمد بن قاسم نے دس ہزار ایسے تاجروں، دست کاروں اور کاشت کاروں کے محصول میں تخفیف کی، جنھیں جنگ کے دوران مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔[22] اسی سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ: "ایک لاکھ بیس ہزار درہم ان دس ہزار شہریوں کو دیے گئے، جن کا مال جنگ میں لٹ گیا تھا تاکہ وہ اپنا حال درست کر سکیں۔"[23]

"اروڑ" سندھ کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا اور پہاڑی پر آباد تھا۔ یہاں پر بدھ مت کے ماننے کی کثرت تھی۔ اس کے محاصرے کے بعد وہاں کے شہریوں کے ساتھ تحریر پانے والے صلح نامے سے مذہبی آزادی اور تعددی ثقافت کو نہ صرف ایک حقیقت کے طور پر قبول کرنے، بلکہ اس کو تحفظ فراہم

---

[19] ۔ ماخذ سابق، ص: ۲۱۴

[20] ۔ ماخذ سابق، ص: ۲۱۵

[21] ۔ ماخذ سابق، ص: ۲۱۴-۲۱۵

[22] ۔ ماخذ سابق، ص: ۲۱۱

[23] ۔ سید سلیمان ندویؒ: تاریخ سندھ، ص: ۹۱

کرنے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بلاذری کے بیان کے مطابق کئی ماہ کے محاصرے کے بعد بالآخر "ارور" کا قلعہ اور شہر درج ذیل شرائط کے ساتھ مسلمانوں کے حوالے کیا گیا:

شہریوں کو امان دی جائے اور کسی فرد کا قتل نہ کیا جائے۔ اور ان کے معبد خانے برقرار رکھے جائیں۔

محمد بن قاسم نے کہا کہ: "میرے نزدیک تمھارے معبد خانے یہود و نصاریٰ کے کنیسوں اور آتش پرستوں کی عبادت گاہوں کی طرح ہیں"۔[۲۴]

سندھ میں مسلم حکومت کے قیام کے ساتھ محمد بن قاسم نے ہندوستانی تعددی معاشرے اور ثقافت کی روایت کو جس طرح سے اسلامی اصولوں پر قائم کیا تھا، بعد کے ادوار یعنی سلطنت اور مغل عہد کے حکمرانوں نے بھی اس روایت کو نہ صرف جاری و ساری رکھا، بلکہ اسے مزید پائیداری عطا کی۔ اس عہد کے مسلم حکمرانوں نے اس تعلق سے خصوصی دلچسپی دکھائی اور انھوں نے اپنے عہد حکومت میں نہ صرف متنوع اور مختلف مذہبی و ثقافتی دھاروں کو ایک ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا، بل کہ اس سے آگے بڑھ کر ایک مشترکہ اور مرکب تہذیبی و ثقافتی روایت کی بنا ڈالی۔

ساتویں صدی عیسوی کے سندھ میں مسلمانوں اور مقامی آبادی کے درمیان ہونے والے باہمی تعامل اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوششوں کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ:

جب فتحیابی کا پہلا طوفان تھم گیا اور ہندو مسلمان ایک پڑوسی کی طرح رہنے سہنے لگے، تو بہت دنوں تک ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے انھوں نے ایک دوسرے کے خیالات، عادات و اطوار اور رسم و رواج کو سمجھنے کی کوشش کی اور بہت جلد ان دونوں قوموں میں اتحاد ہو گیا۔[۲۵]

بعد کے ادوار میں مسلم حکومتوں کے تحت اس باہمی تعامل اور میل جول کے نتیجے میں مسلم عقیدے اور ثقافت کے جو اثرات ہندوؤں پر مرتب ہوئے اسے بھکتی تحریک کی شکل میں اور مسلمانوں پر ہندو معاشرت کے پڑنے والے اثرات کو صوفیہ کے افکار و اعمال میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طرف حکمرانوں نے مقامی لوگوں کے دلوں کو جیتنے کے لیے آخری حد تک رواداری اور تالیف قلب سے کام لیا، دوسری

---

[۲۴] البلاذری، ابوالعباس احمد بن یحییٰ بن جابر: فتوح البلدان، تحقیق: عبداللہ انیس الطباع و عمر انیس الطباع، مؤسسۃ المعارف للطباعۃ والنشر، بیروت، لبنان، ۱۹۸۷، ص: ۶۱۷

[25] Yohanan Friedmann, *Islamic thought in relation to the Indian context in India's Islamic Traditions*, 711-1750, ed. Richard M Eaton, Oxford University Press, New Delhi, 2003, p. 52; Tara Chand, *Influence of Islam on Indian Culture*, The Indian Press Ltd, Allahabad, 1936, p. 137.

طرف صوفیہ نے وسیع المشربی اور انسانیت دوستی کے ذریعے عوام الناس کے دلوں سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے وحشت کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس طرح دونوں قوموں کے درمیان زیادہ سے زیادہ معاشرتی وثقافتی تعامل کی راہیں ہموار ہوئیں۔

عہد جدید کے ہندوستان میں بھی تعددی معاشرے اور ثقافت کا ظہور نظر آتا ہے، مگر جہاں تک ملک کے موجودہ منظر نامے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آج کل اس تعددی معاشرے اور ثقافت کی فضا کو مسموم کرنے کی مسلسل کوششیں ہورہی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہندوستانی تعددی معاشرے اور ثقافت کی فضا کو مکدر کرنے کی یہ کوششیں نئی نہیں ہیں، بلکہ اس کے تانے بانے مسلم دور حکومت کے عہد زوال سے ہی نظر آتے ہیں۔خاص طور پر اگر اس تعددی معاشرے اور ثقافت کی تاریخ کو ہندو مسلم تعلقات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ برصغیر میں یہ دونوں قومیں ہزاروں سال سے زیادہ عرصے سے ایک ساتھ زندگی گزار رہی ہیں،اس کے باوجود بھی ان دونوں قوموں نے چند انفرادی کوششوں اور مستثنیات کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو بالاستیعاب سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔اسی وجہ سے معاشرے کی ہر سطح پر بالخصوص عوام الناس میں ایک دوسرے کے تعلق سے بڑے پیمانے پر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں،ان کے شکار نہ صرف غیر مسلم بلکہ بہت سے مسلمان بھی ہیں۔ان غلط فہمیوں کی مختلف وجوہات شمار کی جاسکتی ہیں۔اسلام اور مسلمانوں کے خلاف افواہوں کی اشاعت میں جہاں مغربی ممالک کے بعض علمی و سیاسی حلقے پیش پیش ہیں، وہیں ہندوستان کے بھی بعض سیاسی و مذہبی حلقوں نے اس کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ اس سے ان کا مقصد دینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی سطح پر مسلمانوں کو کم زور کرکے انھیں ہندو تہذیب میں ضم کرلینا اور ہندوستانی سماج پر ہندو تہذیب کی بالادستی قائم کرنا ہے۔

ان غلط فہمیوں کی ایک اہم وجہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی پروپگنڈے کی وہ نوعیت ہے، جس نے بہتوں کے لیے یہ موقع نہیں چھوڑا کہ وہ شوروغوغا کے اس ماحول سے اوپر اٹھ کر صحیح آواز پر کان دھرنے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ مشرق و مغرب کی اس اسلام فوبیائی ذہنیت نے ان غلط فہمیوں کو عوام الناس کے ذہنوں میں مزید راسخ کردیا ہے۔

برصغیر ہند میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے سیاسی ومادی مفادات کی تکمیل کے لیے نہ صرف ہندو مسلم بھائی چارے اور اتحاد ویک جہتی کو زک پہنچا کر پارہ پارہ کرنے، بلکہ ان کے اندر منافرت و عناد کی دائمی فضا قائم کرنے کی کوشش کی،تاکہ یہ اتحاد کبھی ان کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔اس پالیسی کے

تحت حکومتی سطح پر بہت سے مؤرخین و مصنفین کی سرپرستی کی گئی اور انھوں نے ہندوؤں کے تئیں مسلم دشمنی اور بغض و نفرت کو تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔اسی غلط فہمی اور لاعلمی کا نتیجہ ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں قومیں اپنے باہمی تعلقات کو مغربی بالخصوص مستشرقین کی تحریروں کی روشنی میں دیکھتی اور سمجھتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے تعلقات کی بنیاد بیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہونے والے دو قومی نظریے اور ۱۹۴۷ یعنی تقسیم ہند کو قرار دیتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی حلیف اور حامی و ناصر نہ ہو کر ایک دوسرے کی حریف اور معاند بن جاتی ہیں۔

حاصل مطالعہ: حاصل مطالعہ کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے نہ صرف مذہبی، معاشرتی اور لسانی تعددیت کو، بلکہ تہذیبی و ثقافتی تعددیت کو بھی ایک فطری حقیقت کے طور پر قبول کیا ہے۔ ساتھ ہی انسانی معاشرے میں عدل وانصاف اور امن وسکون کے قیام اور متنوع و تعددی معاشرے کو بکھراؤ سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ رہنما اصول بھی وضع کیے ہیں، جن کے ذریعے تعددی معاشرے میں بود و باش اختیار کرنے والے ہر فرد اور اجتماعیت کو مذہبی، معاشرتی، معاشی، فکری اور اظہار رائے کی آزادی فراہم کی گئی ہے، تاکہ فرد اور معاشرہ اپنی فہم و فراست اور لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانیت کی صلاح و فلاح میں ممد و معاون ہو۔ قرآن وسنت میں موجود ان رہنما اصولوں پر عمل آوری کے ذریعے ہی ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان یعنی سندھ اور ملتان کی عرب حکومت میں ایک مثالی تعددی ثقافتی معاشرے کا قیام ممکن ہوا تھا۔

عالم گیری کے اس عہد میں اگر ہم عصر ہندوستانی معاشرے اور ثقافتیں وحدت آدم اور انسانیت کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی عظیم اور مثبت روایات سے استفادے کی کوشش کریں تو بعید نہیں کہ ان کے اس باہمی تعامل کے ذریعے اسی قسم کا مثالی تعددی معاشرہ دوبارہ قائم ہو، جس کا ہر فرد بلا تفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل اور زبان و علاقہ ایک دوسرے کا معاون و مددگار ہو اور اپنی صلاحیت و لیاقت کے مطابق معاشرے اور ملک و قوم کی ترقی کا جذبہ رکھتا ہو۔

محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیاۃ محمد ﷺ" کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالحفیظ

استاذ مساعد، شعبۂ عربی، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ

hafizalig2@gmail.com

محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸-۱۹۵۶ء) کی ولادت ایک دیہاتی خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی وثانوی تعلیم کے بعد انھوں نے مدرسۃ الحقوق (لاکالج) سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے دوران تعلیم قدیم مآخذ کا مطالعہ کیا۔ ان کے ذہنی ارتقاء میں عربی، اسلامی اور مغربی تہذیب وثقافت نے نمایاں رول ادا کیا۔ عنفوان شباب ہی سے وہ اسلام اور ملک دونوں کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں تھے۔ احمد لطفی السید (۱۸۷۲-۱۹۶۳ء) کی تربیت اور طہٰ حسین (۱۸۸۹-۱۹۷۳ء) کی معیت نے ان کی علمی وفکری صلاحیت کو نکھارنے میں مدد دی۔ انھوں نے مسلمانوں کے دینی انحطاط کا مرثیہ پڑھنے والے فرانسیسی ادیب ڈوک ڈار کو (Duc Darko) کو منہ توڑ جواب دیا اور ملت اسلامیہ کے جمود وتعطل کو توڑنے کی ہر ممکن سعی کی، جس کی وجہ سے آپ کی علمی وفکری عظمت کا اعتراف کیا گیا۔ انھوں نے مختلف علوم وفنون پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں جن میں أوقاتُ الفَراغ، السیاسۃ المصریۃ والانقلاب الدُّستوری، تراجِمُ مصریّۃٍ وغربیّۃٍ اور الطُّغاۃُ وحرّیۃُ القَلَمِ (سرکش حکمراں اور قلم کی آزادی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ ہیکل نے اولین اسلامی مصادر سے استفادہ کیا، رسول اکرم ﷺ، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی زندگی اور خدمات کا جدید انداز سے تجزیہ کیا اور اپنی وسعت نظری وفکری اور دقت بحث کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ ان کی کتاب "حیاۃ محمد ﷺ"[۱] اپنے علمی اور تجزیاتی اسلوب کی بنیاد پر اہل علم کے مابین متداول ہے۔ جدید سیرت لٹریچر میں اسے انفرادی حیثیت حاصل ہے۔

محمد ﷺ ایک ایسا نام ہے جو ہزار ذکر کے باوجود ذہن انسانی کے لیے باعث فرحت ونشاط ہے اور تاقیامت اس کا حسن شباب پر رہے گا۔ ان کی دعوت امن وامان کا ملجا وماویٰ ہے اور ان کی پیروی کامرانی کی

---

[۱] محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، القاہرۃ، ۱۹۵۲ء، الطبعۃ الخامسۃ، ص ۶۲۹

دلیل ہے۔

آپ ﷺ کی پیدائش کے یوم، ماہ وسال اور وقت شب وروز میں اختلاف ہے لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک ابن اسحاق کی روایت قابل قبول ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت ۱۲ ربیع الاوّل ۵۷۰ء میں ہوئی۔

آپ ﷺ کی ولادت کے ساتویں روز دادا عبد المطلب نے اونٹ ذبح کر کے اہل قریش کو کھانے پر مدعو کیا اور آپ کا نام ''محمد'' رکھا۔ مدعوین نے ''محمد'' نام رکھنے کی وجہ دریافت کی تو آپ کے دادا نے فرمایا کہ: ''اس امید خیر کے ساتھ کہ ارض وسماء دونوں جگہوں میں میرے لخت جگر کی تعریف وتوصیف ہو!''[۲]

آپ ﷺ نے اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا اور ایک جیتی جاگتی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ آپ کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہر زمانے کے لیے یکساں مفید اور قابل اتباع ہے اور یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ آپ بت پرستوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے اور یہود ونصاریٰ کے ساتھ مناظروں میں مسیحیوں کی کتابوں اور اپنی وحی کے مطابق مکالمہ فرماتے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ أَبْنَآءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّآؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ (سورة المائدة ۵: ۱۸)

(یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے دوست ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ پھر تمہیں تمہارے گناہوں کے باعث اللہ کیوں سزا دیتا ہے؟ نہیں بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے ایک انسان ہو، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے)۔

عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّآ إِلٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ(سورة المائدة۵:۷۳)

(وہ لوگ بھی قطعاً کافر ہوگئے جنہوں نے کہا، اللہ تین میں سے تیسرا ہے۔ دراصل سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس قول سے باز نہ رہے تو ان میں سے جو کفر پر رہیں گے، انہیں المناک عذاب ضرور پہنچے گا)۔

ان کے غلط عقیدہ کا قرآن کریم میں یوں ذکر ہے:

۲۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۱۰۸-۱۰۹

إِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ.(القرآن،۳ : ۵۹)

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال ہو بہو آدم (علیہ السلام) کی مثال ہے جسے مٹی سے بنا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا! پس وہ ہو گیا۔)

دوسری جگہ اللہ نے اپنی وحدانیت کو یوں بیان کیا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ. اللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ.(القرآن،۱۱۲ : ۱-۳)

(آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے، اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔)

فرانسیسی فرہنگ لارُوز میں آنحضرت ﷺ کی ذات پر عیسائی مصنفین کی چند زہر آلود نمونے ملتے ہیں۔ ان میں نبی کو بد کردار، جادو گر، لٹیرا، ریاکار اور جدید دین کا بانی کہا گیا ہے۔ رینو اور فرانسوا میشیل نے ۱۸۳۱ء میں آپ ﷺ پر حرف گیری کی، بیل نے قرآن کے تاریخی واقعات کی تخریج میں پوری طرح زہر اگلا کہ آپ ﷺ نے اپنی روحانی قوت سے اخلاقی اور اجتماعی نظام کو مربوط کیا اور اگر اسلام میں ''قصاص'' اور ''تعدد ازدواج'' نہ ہوتا تو مسیحی اجتماعیت اور اسلامی نظام میں کوئی فرق نہ تھا۔[۳]

فرانسیسی مصنف اِمیل درمنگھم نے بعض بے انصاف مسیحی مصنفین کی عبارتیں نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

مسلمان اور عیسائیوں کی جنگ شروع ہوتے ہی دونوں فرقوں میں اختلاف و بدگمانی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ آگ دن بدن تیز ہوتی گئی اور اہل مغرب نے اپنے دامن سے ہوا دے کر اسے اور بھی مشتعل کر دیا اور بغیر تحقیق کئے اسلام پر الزام تراشی میں حد سے تجاوز کر گئے۔ ان پر خدا بن بیٹھنے کی۔ افتراپردازی کی پِچیبر دِنوچن نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ محمد نے شراب کی مستی میں جان دی اور اس کے متبعین نے ان کی لاش کو کوڑا کرکٹ کی جگہ میں ڈال دیا، خنازیر نے اس لاش کو اپنا لقمہ بنایا جس کی وجہ سے اس جانور کا گوشت حرام قرار پایا۔[۴]

''قصہ محمد'' (۱۸۳۱) کے مصنف رینو اور فرانسوا میشیل Renault and François Michel دین اسلام کی غلط ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام میں ایک عورت کے لیے متعدد شوہر جائز ہیں۔

---

[۳] محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۹

[۴] Emile Dermenghem, *The Life of Mahomet*, George Routledge & sons. Ltd., London,1930, p.135-137

ایمون لیون اور گیوم باستل نے اسلام کو آرائے مختلفہ ومتضاد عقائد کا مجموعہ ثابت کر دکھایا[۵]۔

الغرض کینہ پرور، ہذیان گو مسیحی مصنفین نے اسلام کو خرافات واعمال شیطان کا نتیجہ، مسلمانوں کو وحشی اور قرآن کو مبتذل قرار دیا، البتہ چند علمائے مغرب نے اپنی تصانیف میں اسلام کے متعلق کچھ انصاف سے کام لیا ہے، ان میں کاؤنٹ بولنتھلیہ، شول، کُوسّان دِبِر سقال، ڈوزی، اسپر نگر، بارتلمی سانتیلیر، دکاستری، کارلائل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان میں بعض مصنفین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ محمد ﷺ کو خود پر نازل شدہ رسالت میں صدق دل سے یقین تھا اور انھوں نے خدا کے احکام کی بجاآوری اور ترسیل میں ہمیشہ امانت داری کا ثبوت دیا اور ان کو اخلاق حمیدہ کا دلکش مجسمہ ہونے کی وجہ سے بھی سراہا ہے۔ بعض نے آنحضرت ﷺ کی عظیم روحانیت کے ساتھ آپ کے حسن کردار، حسن گفتار اور علو مرتبت کا اعتراف کیا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں میں ہرقل اور عیسائیوں کی نصرت کا جذبہ یہاں تک موجزن تھا کہ حضرت محمد ﷺ کے متبعین اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے دونوں گروہوں کے درمیان آپ ﷺ کی زندگی ہی میں مثل مواخات قائم ہو چکی تھی۔ اس دور میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کبھی مجادلہ یا تنازعہ نہ ہوا بخلاف یہودیوں کے کہ جب مسلمان ہجرت کے بعد مدینہ پہنچے تو انھوں نے مذہبی اور سیاسی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور یہ آگ سلگتی ہی رہی جس کی پاداش میں یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن ہونا پڑا۔ مسلمان، یہود ونصاریٰ کے باہمی مقدمات ونتائج کا تذکرہ درج ذیل آیت میں تذکرہ ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ.(القرآن،۵ : ۸۲)

یقیناً آپ ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے اور ایمان والوں سے سب زیادہ دوستی کے قریب آپ یقیناً انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاری کہتے ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں علماء اور عبادت کے لیے گوشہ نشین افراد پائے جاتے ہیں اور اس وجہ سے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔

مسلمان اور عیسائی بڑی حد تک عقائد میں متفق الرائے ہیں اور دونوں انسانی زندگی کی آغاز تخلیق آدم کو قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ وحضرت مریم کا ذکر جس خوبی سے مذکور ہے اس سے

---

[۵] محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، مؤسسة هنداوي للتعليم والثقافة القاهرة، ص ۳۱

خداوند عالم کی طرف سے دونوں کی تکریم ثابت ہوتی ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی دونوں قومیں صدیوں سے برسرپیکار ہیں؟

مسیحیوں کی اسلام دشمنی کے اسباب

۱- اسلام اور عیسائیت کے کچھ بنیادی عقائد میں تضاد نے فریقین کو بحث ومباحثہ پر ابھارا اور یہ بحثیں باہمی دشمنی اور بغض کی حد تک پہنچ گئیں۔ نصاریٰ محمد ﷺ کی نبوت کے منکر ہیں مگر مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں۔ نصاری تثلیث کے قائل ہیں اور مسلمان توحید پر قائم ہیں اور اللہ رب العزت کی ذات میں کسی کی اجارہ داری برداشت نہیں کرتے مگر مسیحی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے یہ دلائل پیش کرتے ہیں:

حضرت مسیح کو جو معجزے عطا کئے گئے کسی دوسرے پیغمبر کو نصیب نہ ہوئے۔

حضرت مسیح نے گہوارے میں کلام کیا۔

حضرت عیسی خدائی کے رتبہ تک جا پہنچے کیوں کہ مردوں کو زندگی دینا، مادرزاد اندھوں کو بینائی عطا کرنا اور برص زدہ اشخاص کو شفائے کامل بخشنا وغیرہ۔ یہ تمام صفات خدا ہی کے ہوسکتے ہیں۔[۶]

۲- اسلام کی حقیقت اور محمد ﷺ کی سیرت سے ناواقفیت بھی اس دشمنی کی سبب ہے کیوں کہ اپنے حریف کے سوانح و کوائف سے بے خبری تعصب وعدوان کی اہم بنیاد ہے۔[۷]

۳- اسلام کی حقانیت نے مسیحیوں کی غرور طاقت اور ہوسِ ملک گیری پر روک لگادی۔ حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے اپنی بادشاہت و حکمرانی کے زوال پذیر ہونے کے خوف سے قبول اسلام کا انکار کیا۔

۴- اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کی مقبولیت نے غلط بیانی پر ابھارا۔

۵- عیسائیوں کے قبول اسلام نے مسیحیت میں بے چینی پیدا کردی جس کی وجہ سے بعض عیسائی علماء سوء نے اسلام کی تحقیر وتذمیم شروع کردی۔

۶۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، القاہرۃ، ۱۹۵۲ء، الطبعۃ الخامسۃ، ص ۵-۶

۷۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۱۲

۶- مسلمانوں کا معرکوں میں کامیابی نے عیسائیوں کو اسلام کی مخالفت پر ابھارا۔

۷- مسلمانوں کی تجارت کے فروغ نے عیسائیوں کے دل ودماغ میں کینہ بھر دیا۔

۸- مسلمانوں کی دیانت وصداقت کی شہرت عیسائیوں میں عام ہونے کی وجہ سے ان کے علماء وراہبوں نے اسلام پر طعن وتشنیع شروع کیاتا کہ ایسا نہ ہو کہ مسیحیت کا خاتمہ ہو جائے اور ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے۔

۹ -مغرب کو دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی ہوس ہے اور اس نے پس ماندہ اقوام کو اپنے نوآبادیات میں شامل کرنے کی مہمیں چھیڑ دیں۔[۸]

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریاضت غار حرا میں کس مسلک پر تھی؟ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب ''البدایۃ والنہایۃ'' میں متعدد اقوال نقل کرتے ہوئے یوں روشنی ڈالی ہے: ''حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی شریعت کے مطابق یا خود اپنی شریعت کے مطابق، ان میں آخری قول زیادہ قابل قبول ہے کیوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فکر وتامل کا یہی مقتضی ہے''۔[۹]

یہ حقیقت ہے کہ انسان مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھر جانے کے بعد تنہائی کا خواستگار ہوتا ہے اور اس کا دل معبود برحق کی تلاش اور خوشنودی سے معمور ہو جاتا ہے۔اُس دور میں متقشف اور ریاضت کرنے والے اشخاص سال میں ایک مرتبہ آبادی سے دور جا کر عبادت میں مستغرق ہو جاتے۔ ان کا مقصد بتوں سے تقرب اور ان کے جود وکرم کا حصول ہوتا تھا۔ان کی ریاضت خود ساختہ بھی ہو سکتی ہے اور کسی پیغمبر کی طریقۂ اتباع پر بھی۔[۱۰]

مغربی اہل قلم نے جس کدوکاوش کے ساتھ اسلام اور مشرق کے مسائل جمع کئے ہیں، ان کی کوششوں کا اعتراف بجا ہے لیکن کلیسائی طبقے کی تصانیف اغلاط وزوائد سے پر ہیں کیوں کہ ان کا مقصد تحقیق نہیں تھا بلکہ اسلام سے لوگوں کو دل برداشتہ کرنا تھا۔ہمارا فرض ہے کہ مغربی اہل قلم کے اسلام اور مشرق پر عائد کردہ الزامات وطریق استدلال اور انداز فکر کی تردید کریں، اپنی اسلامی میراث کی حفاظت

---

[۸]۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۱۲

[۹]۔ البدایۃ والنہایۃ، حافظ ابن کثیر، مرکز البحوث والدراسات العربیۃ بدار ہجر، الجیزۃ بمصر، ۱۴۱۷/۱۹۹۷ء، الطبعۃ الاولی، ج ۴، ص ۱۴

[۱۰]۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۱۳۰

کریں۔ مغربی استعمار نے اسلام اور بانیٔ اسلام پر ہی زبان درازوں کو شہ نہیں دی ہے بلکہ مسلمانوں میں بھی ایسے جامد اور کج عقیدہ علماء کو بھی جنم دیا ہے جو یہ کام کرتے ہیں۔ مصطفی کمال پاشا اور ان کے رفقاء احرار، غازی امان اللہ خان والی افغانستان اور سلمان رشدی و تسلیمہ نسرین کے خلاف علماء اسلام نے کفر وارتداد کا فتوی دیا اور ان کی اسلام دشمنی کو واضح کیا۔

دور رسالت میں مکی زندگی کا نظام شخصی اطاعت کے بجائے جمہوریت کے مشابہ تھا۔ محمد ﷺ اپنی خاندانی وجاہت کی وجہ سے خود ممتاز اور امین وصادق کے اعلیٰ نمونہ تھے اور سیادت کے اعتبار سے اس قبیلہ کے فرد تھے جو کعبہ کی حجابت اور حاجیوں کی سقایت میں سربلند تھے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ مال وجاہ یا دینی وسیاسی برتری کے خواہاں نہیں تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں جلوہ افروز ہوئے جہاں کے باشندے فرعون کو اپنا خدا تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس انقلاب کے لیے مامور کیا تھا وہ اصلاً سیاسی انقلاب تھا اور ضمناً دینی! حضرت موسیٰ چاہتے تھے کہ فرعون اور غریب باشندے دونوں اپنے خدا کے سامنے ایک مقام پر کھڑے ہوں مگر اس وقت تک مصر میں امراء وغرباء کے مابین مساوات قائم نہیں ہوسکتی تھی جب تک فرعون کی خدائی صفحۂ ہستی سے ختم نہ ہو جاتی اور اس کے لیے سیاسی نظام میں انقلاب لازمی شرط تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش فلسطین میں ہوئی۔ اس زمانے میں فلسطین قیصر روم کے زیر نگیں ہونے کی وجہ سے عمائدین شاہی کے ظلم کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے لوگوں کو ان کے مظالم پر صبر کرنے کی تلقین کی اور خدا کے حضور گناہوں کی معافی اور اس کی نعمتوں کی فراوانی کی دعاؤں پر انہیں ترغیب دیتے رہے لیکن حکومت وقت نے مؤمنین کی اتنی سی تبدیلی بھی سیاست اور اقتدار کے لیے برداشت نہیں کی اور حضرت عیسیٰ کو سزا دینے کی فکر میں لگ گئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی دعوت سیاسی انقلاب کے لیے تھی جب کہ محمد اکرم ﷺ کی دعوت روحانیت میں انقلاب وسربلندی پر مبنی تھی۔ آپؐ کی دعوت کا ہر پہلو جمال معنوی اور حسن ظاہری کا دلکش مرقع تھا۔ اسی لیے اہل مکہ کے سیاسی وجمہوری انقلاب سے ٹکرانا آپ کے اصل مقاصد میں نہ تھا۔[۱۱]

کائنات کا ہر فرد ایک دوسرے کے ساتھ حلقۂ زنجیر کی طرح بندھا ہوا ہے اور نوع انسان کا دوسرے حیوانات اور اشجار واحجار سے ربط دائمی ہے۔ ارض وسماء، شمس وقمر اور ستارے اپنے محور میں محو گردش

۱۱۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۱۴۸-۱۵۰

ہیں ان میں سے کوئی بھی اپنے مقررہ عمل سے ذرہ برابر بھی کوتاہی کرے تو دنیا کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ارض و فلک، مہر و ماہ اور اس کے دوسرے رفقائے فلک کے ہر ذرے کا جس طرح ایک دوسرے سے ربط ہے اسی طرح ان سب کا ربط ایک ایسی ذات اور ایک ایسی طاقت سے ہے جو ان کے نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ ربط و تعلق رکھنے میں پاسبانی کر رہی ہے بلکہ وہ طاقت ایک دوسرے کے تصادم پر نگراں ہے۔ لہذا انسان کو اسی روح جاوداں کی پیروی کرنی چاہیے جس کے حضور تمام کائنات حکما سر بسجود ہے۔ اس انکشاف حقیقت کے بعد ہر قسم کے اصنام، بادشاہ، آگ اور سورج کی پرستش ہیچ نظر آتی ہے۔ افسوس انسان جیسی عظیم ہستی پہلے تو انھیں وہم و باطل سمجھ کر ٹھکرا دیتی ہے پھر ذات حقیقی کی قربت اور نوازش حاصل کرنے کے لیے ان کی پرستش کو وسیلہ بنا لیتی ہے۔ لیکن مکہ کے خوش نصیب لوگوں نے دعوت محمدیہ کے جوہر کو پرکھ لینے کے بعد اسے قبول کیا۔ محمد ﷺ نے مؤمنین پر یہ بھی منکشف فرمادیا کہ اگر وہ سچے دل سے اس راہ پر گامزن ہوں گے تو دنیا و آخرت دونوں میں اس نیکی کے اثرات سے فیض یاب ہوں گے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۔(القرآن،۹۹: ۷ ۔ ۸)

(پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔)

رسول اللہ ﷺ کے اثبات قدم اور اسلام کے فروغ سے کفار مکہ کے دل دہل گئے تھے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ کون سی ایسی طاقت محمد ﷺ کے متبعین کو مرحمت ہو رہی ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کو پاش پاش کرنے کے لیے سینہ سپر ہیں۔[۱۲] قریش مکہ یہود و نصاریٰ سے سنتے تھے کہ اعمال بد کی سزا جہنم ہے لیکن یہ بات ان کے سامنے جس شدت کے ساتھ وحی الٰہی کی زبان میں پیش کی گئی اس میں یہود و نصاریٰ کی زبان سے کہیں زیادہ شدت تھی۔[۱۳] جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔(۲۷ :۹۰)

(اور جو برائی لے کر آئیں گے وہ اوندھے منہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ تم کو صرف وہی بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے۔)

۱۲۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۱۵۰۔۱۵۱

۱۳۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۱۷۹

اسی طرح سے اسلام نے اہل خیر کے لیے جنت کا بہترین تصور پیش کیا اور خداوند کا ارشاد ہے:

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ.(۳ : ۱۳۳)

(اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔)

دنیا میں جتنے بھی نبی و رسول آئے سب کا زماں و مکاں خاص تھا۔ سب نے دنیا کو انسانیت کا درس دیا، سکون و سلامتی کا سبق سکھایا نیز اضطراب و زحمتوں اور بے اطمینانی سے بچانے کی انتھک کوششیں کیں لیکن ان کی شریعتیں ناتمام تھیں اور ان کی رحمتیں خاص قوم و ملت کے لیے تھیں جب کہ نبی آخر الزمان ﷺ کی شریعت عام، آپ کی رحمت عام، آپ کی دعوت لازوال و بے مثال اور اقوام عالم کی ہدایت، کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (۳۴ : ۲۸)

(ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ہاں مگر (یہ صحیح ہے) کہ لوگوں کی اکثریت بے علم ہے۔)

دوسری جگہ ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ(۲۱ : ۱۰۷)(اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔)

خاتم الرسل اور انبیائے سابقین کے طریق ہدایت میں فرق

رسول اللہ ﷺ سے پیشتر انبیاء مثلاً موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور دونوں سے پہلے آنے والے انبیاء کرام کی تبلیغ کے دو ذریعے تھے: مخالفین کے ساتھ مناظرہ اور ظہور معجزات۔ یہ انبیاء و رسل دنیا سے رخصت ہونے سے قبل اپنے معتمدین و خواص کے لیے اشاعت دین کا طریقہ متعین کر جاتے۔ یہ لوگ سیاسی حربوں سے اپنے دین کی حفاظت کرتے اور اپنے عقیدے کی فلاح و بہبود کے لیے خون ریزی کے لیے بھی تیار رہتے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے دین کی اشاعت کے لیے ہر قسم کی صعوبت کو برداشت کیا۔ بعد میں عیسائی بادشاہوں نے عیسائیت کی حفاظت و اشاعت کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ اسی طرح دنیا کے تمام مذاہب کی ترویج ہوئی۔ لیکن خاتم الرسل کے دوسرے خصائص نبوت کے ساتھ یہ تخصیص بھی آپ کی ذات میں تھی کہ اللہ نے اسلام کی ترویج و اشاعت کا مدار اپنے رسول ہی پر رکھا۔

آپ ﷺ خدا کے رسول، داعی، مبلغ اور دور اندیش سیاست داں و مجاہد بھی تھے اور آپ نے اپنے ہر قول و فعل سے ایک بین ثبوت پیش کیا۔

آنحضرت ﷺ نے انصار و مہاجرین کو یک جا کر کے ان میں مواخات فرمائی اور ان کے درمیان بھائی بندی کا ایسا اٹوٹ رشتہ قائم کر دیا جو جدی اور نسبی رشتے سے زیادہ مستحکم و مضبوط تھا۔ منافقوں نے مہاجر و انصار کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کافی کوششیں کیں لیکن ان کو ناکامی ہی ہاتھ آئی۔ نبی ﷺ نے ان تمام نزاکتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مہاجر و انصار اور یہود کے مابین ایک تحریری معاہدہ مرتب فرمایا جس کی رو سے انھیں اپنے دین پر قائم رہنے کی پوری آزادی دی گئی اور ان کے مال و جائداد کی باہمی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔

متن معاہدہ کے چند نقاط یہ ہیں:

۱- مہاجرین و قریش ایک ہی جماعت ہیں۔ یہ دوسروں کی طرف سے اور خود آپس میں دیت اور خون بہا کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوں گے۔

۲ - مدینہ کے رہنے والوں کے حقوق کا وہی لحاظ ہوگا جو ان میں پہلے سے رائج ہے جس کے مطابق انہیں دیت اور خون بہا لینے اور ادا کرنے کی پابندی کرنا ہوگی، اس میں کسی فریق کو کسی پر ترجیح و تفوق حاصل نہ ہوگا۔ ادائے دیت و خون بہا دینے کی صورت میں مسلمان اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کوئی اور راستہ نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کوئی کسی کے غلام پر قبضہ نہیں کرے گا۔

۳- مسلمانوں کا فرض ہے کہ کسی کی سزا کی تخفیف و تکثیر میں قرابت داری کا خیال نہ رکھیں گے اور ایک دوسرے کو کسی کافر کی طرف داری میں قتل نہ کریں گے، نہ مسلمان کے خلاف کسی کافر کی نصرت کریں گے۔ خدا تعالیٰ کا ذمہ سب کے لیے مساوی ہے۔

۴- یہودیوں میں سے جو شخص ہمارے معاہدے کی پابندی کا وعدہ کرے ہماری نصرت اور یاوری اس کے لیے بھی ہے۔ اس کے دشمن کے مقابلہ میں ہم اس کے دوش بدوش مقابلے میں شریک رہیں گے۔

۵- مسلمان اپنے باہمی اختلاف میں خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہیں۔ اس معاہدے میں سے کوئی شخص محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ قرار نہ پائے گا۔ ہر قاتل سزا کا مستحق ہوگا۔ جو شخص کسی کو فریب سے قتل کرے گا اس کا قاتل ہی اصل ذمہ دار ہوگا اور اگر وہ مفرور ہو گیا تو قاتل کے ورثاء سے انتقام لیا جائے گا۔

۶- اگر مدینہ پر حملہ آور لشکر مسلمانوں سے صلح کرنا چاہے تو معاہدے کے تمام شرکاء کو متفق ہو کر دشمن سے صلح کرنا ہوگی۔ یہ قرار داد معاہدہ کسی ظالم اور مجرم کی حمایت نہ کرے گی۔ شرکاء معاہدہ

میں سے اگر کوئی شخص مدینہ میں اپنی سکونت رکھے یا اس کے باہر بسیرا کرے ارتکاب جرم کے بغیر اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

یہ تحریری معاہدہ ہے جس کی رو سے محمد ﷺ نے انسانی معاشرے میں ایسا ضابطہ قائم کیا جس کی رو سے شرکائے معاہدہ میں سے ہر فریق کو عقیدے میں آزادی، اموال کے تحفظ کی ضمانت حاصل تھی ارتکاب جرائم پر یوں گرفت نے امن وسکون عطا کیا۔اور معاہدین کی بستیوں کی عزت ورفعت قائم ہوگئی۔[۱۴]

آپ ﷺ نے اسلامی تمدن کی بنیاد مساوات قرار دی اور فرمایا:

لایومن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه[۱۵] (تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس کے بغیر کامل نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسرے بھائی کی خیر خواہی اپنے نفس کی ہمدردی کے برابر کرے)

یہاں تک کہ آپ نے اس مساوات میں ایسی مہربانی اور لطف کی تعلیم فرمائی جس میں کسی کو کسی قسم کی تکلیف وزحمت کا احساس نہ ہو۔ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ اسلام میں پسندیدہ عمل کون سا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

تطعم الطعام وتقرأ السلام على من عرفت ومن لم تعرف۔[۱۶] (حقداروں کے لیے غذا کی بہم رسانی اور شناسا و غیر شناسا ہر ایک کے لیے تقدیم سلام)!

نبی ﷺ کے وعظ و نصیحت اور دعوت وارشاد اور ہدایت ہی عوام میں تبلیغ کے اسباب نہ تھے بلکہ آپ کی زندگی تبلیغ کا جامع اور کامل ترین نمونہ تھی۔آپ دوسروں کے مقابلے میں تفوق و برتری کے خواہاں نہ تھے۔جیسا کہ آپ نے یثرب کے دوسرے خطبے میں فرمایا:

اعبدوا الله ولاتشركوا به شيا واتقوه حق تقاته واصدقوا الله صالح ما تقولون بأفواهكم وتحابوا بروح الله بينكم ان الله يغضب ان ينكث عهده[۱۷] (صرف ایک خدا کی عبادت کرو اس طرح کہ کسی اور کو اس کا شریک نہ گردانو! اس ذات یکتا سے پوری طرح ڈرتے رہو اور اس

---

[۱۴]۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۲۲۲-۲۲۳

[۱۵]۔ الصحیح للبخاری، رقم ۱۳/۱ الصحیح للمسلم، رقم ۴۵/۱) السنن للترمذی، رقم ۲۵۱۵

[۱۶]۔ الصحیح للبخاری، رقم ۱۲

[۱۷]۔ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۹۹۰ء، الطبعۃ الثالثۃ، ۲، ص ۱۴۲
زاد المعاد لابن القیم الجوزیۃ، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ السابعۃ والعشرون، ۱۹۹۴ء ص ۳۷۴/۱

کی راہ میں صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ خدا کی رضا طلبی کے لیے باہم محبت کرو۔ خدا تعالیٰ اس شخص پر غضب ناک ہوتا ہے جو اس کے عہد کو توڑ دیتا ہے)

آپ ﷺ نے انسانوں کے درمیان برادری واخوت میں ایک ہمہ گیر معاشرے کا آغاز فرمایا۔ آپ کا لطف وکرم صرف انسان ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ حیوانات بھی اس سے مستفید ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ناقہ کو سختی سے ہانکنا چاہا تو فرمایا: ''علیک بالرفق''[۱۸] (اس سے نرم سلوک کرو)۔

نبی کریم ﷺ کی اس مہربانی ولطف وکرم میں نہ تو کسی قسم کا تکلف وتصنع تھا نہ ہی کسی قسم کی زبوں حالی تھی بلکہ آپ کو یہ مقام اللہ سے قربت اور انسانیت سے محبت نے عطا کیا تھا۔

اسلامی تمدن کی بنیاد دوسری قوموں کے تمدن سے مختلف ہے۔ اسلام میں ایسی مساوات ہے جس میں ایک دوسرے کی پوری نگہداشت ممکن ہے۔ ارشاد باری ہے:

قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ. (۱۹۴/۲) (اگر کوئی شخص تم پر زیادتی کرے تو اس (زیادتی) کے برابر تم اس سے اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہو!)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. (۱۷۹/۲) (اے ارباب دانش! جان کے بدلے میں جان لینا معاشرہ میں زندگی کی حفاظت کرتا ہے۔)

اخوت اور باہمی احسان ومراعات کا مدار رضائے الٰہی کی طلب پر ہونا چاہیے اور اس قسم کے خصائل واطوار کا صدور ایسے شخص کی طرف سے مشاہدے میں آنا چاہیے جس کا شعار تقویٰ وپرہیز گاری ہو۔ محمد ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہجرت سے مقصد یہ تھا کہ کفار مکہ کی اذیت اور دباؤ سے نکل کر آزادی کے ساتھ عبادت وریاضت کر سکیں اور نفسانی خواہشات ومادیت کی محبت سے لوگوں کو بچایا جا سکے۔

نبی ﷺ کی زندگی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپ ﷺ اپنی خواہشات پر قادر اور حکم فرماتے تھے، کبھی مادیت کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے، شکم سیر ہو کر کبھی نہیں کھاتے تھے، عام غذا میں کھجوریں اور پر تکلف موقع پر ستو اور ثرید کا استعمال کرتے تھے۔[۱۹]

---

[۱۸] ۔ الصحیح لمسلم، رقم ۲۵۹۴

[۱۹] ۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۲۲۹-۲۳۲

مستشرقین اور جہاد فی سبیل اللہ کی اسلامی توجیہ

مستشرقین نے مؤمنین کے قیام یثرب کو غلط رخ دیتے ہوئے کہا ہے کہ مدینہ میں استقرار کے بعد رسول اللہ اور مہاجرین سب کے سب اس وقت کے لیے چشم براہ تھے کہ جونہی موقع ہاتھ لگے مکہ والوں کے ساتھ جنگ چھیڑ دی جائے۔اس کے علاوہ یہ حضرات ان گشتی دستوں کی تعبیر میں کہتے ہیں کہ مؤمنین اہل مکہ کے تجارتی قافلوں پر غارت گری کرنا چاہتے تھے جس کی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ لوٹ وغارت ان بادیہ نشینوں کا پیشہ ہی تھا۔اس لیے مدینہ کے مسلمان عقبہ کی بیعت کے باوجود رسول اللہ کے سائے میں اموال غنیمت اور لوٹ مار کرنے میں اپنا نفع تصور کرتے تھے۔ مستشرقین کے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں کیوں کہ :

(۱) اہل مدینہ بھی اہل مکہ کی طرح ایسی مدنی زندگی کے خوگر تھے جس میں لوٹ پاٹ اور غارت گری کی جگہ نہیں ہوتی ہے۔

(۲) اہل مدینہ زراعت پیشہ تھے۔ وہ اپنی کھیتی کو سرسبز وشاداب رکھنا چاہتے تھے۔ان کی سادہ لوحی ان کو جنگوں سے دور رہنے پر مجبور کرتی تھی البتہ ازخود سر پر آن پڑتی تو مجبوراً جنگ میں حصہ لیتے تھے۔

لیکن مہاجرین کی حالت اپنے انصار بھائیوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ غاصب قریش مکہ کے قبضے سے اپنے مال ومتاع کے حصول کے لیے بے قرار تھے تاہم واقعۂ بدر سے قبل انھوں نے اس معاملہ میں کسی عجلت سے کام نہیں لیا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کا گشتی دستوں کو ادھر بھیجنا قریش کے تجارتی قافلوں کی لوٹ اور غارت کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی موقعہ پر جہاد میں سبقت نہیں فرمائی اور نہ ہی جہاد کا اقدام بدویانہ ذہنیت کا متحمل تھا بلکہ یہ بات حقیقت ہے کہ آپ اور آپ کے اصحاب اپنے حقوق کے حصول کے لیے بے قرار تھے لیکن دین حق کی وجہ سے کبھی پہل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔[۲۰]

اسلام میں دفاع، اپنے عقیدے کی حفاظت واظہار میں جنگ کرنا روا ہے۔ بلکہ اسلام نے اس وقت سے لے کر آج تک اور رہتی دنیا تک دفاعی جنگ کو فرض قرار دیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس

---

[۲۰]۔ ماخذ سابق، ص ۲۴۷

جنگ میں دشمن پر حد سے زیادہ سختی نہ ہو:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ. (۲/ ۱۹۰)

اور (دیکھو) جو لوگ تم سے لڑائی لڑ رہے ہیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی ان سے لڑو (پیٹھ نہ دکھلاؤ) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں!

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (۵:۲)

(نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں مدد نہ کرو۔)

نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کی دفاع کے لیے عبد اللہ بن جحش کی سربراہی میں ایک گشتی دستہ (مکہ وطائف کے درمیان واقع) نخلہ روانہ کیا تاکہ قریش مکہ کی سن گن لی جاسکے۔ جب یہ حضرات نخلہ میں پہنچے تو قریش مکہ کا تجارتی قافلہ وہاں نظر آیا۔ قافلے کا سردار عمرو بن حضرمی تھا۔ دیکھتے ہی مسلمانوں کا خون کھول اٹھا اور ان کے ظلم زیادتی کا نقشہ سامنے نظر آنے لگا کہ انہی لوگوں نے ہمیں ہمارے گھر بار اور مال و متاع سے محروم رکھا ہے! تاہم مسلمانوں نے مشورہ کرنا ضروری سمجھا اور اس قضیہ میں دو گروپ ہو گئے:

۱-واللہ لئن ترکتم القوم هذه الليلة ليدخلن الحرم فليمتنعن منكم به[۲۱] (بخدا! اگر تم نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ شب بھر میں حرم میں داخل ہو جائیں گے پھر ان پر تصرف کجا)!

۲-ولئن قتلتموهم لتقتلنهم في الشهر الحرام[۲۲] (اگر ان پر حملہ کیا تو یہ جنگ حرمت کے مہینے میں ہو گی!)

مسلمان تذبذب میں پڑ گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ان کا ذہن صاف ہو گیا اور وہ کفار پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مسلمان (حضرت واقد سہمی) کے تیر سے عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ مسلمانوں نے دو آدمیوں کو گرفتار کر لیا جن کے ساتھ قافلہ کا مال و اسباب بھی ہاتھ آیا۔ جب دو قیدی اور مال غنیمت نبی ﷺ کی خدمت

---

[۲۱]۔ السیرۃ النبویۃ، ج ۲/ص ۲۴۵، الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ لابی بکر محمد بن موسیٰ الہمذانی، جامعۃ الدراسات الاسلامیۃ، کراچی، ص ۴۹۹

[۲۲]۔ ماخذ سابق

میں پیش کیئے گئے تو آپ نے فرمایا: ما امرتکم بقتال فی الشھر الحرام[۲۳] (میں نے حرمت کے مہینہ میں جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔)

یہ سن کر دونوں اسیر دم بخود رہ گئے اور آپ ﷺ نے قیدی اور اسباب دونوں میں سے کسی شے کو قبول نہیں کیا۔ ادھر قریش کو نفرت پھیلانے کا موقع مل گیا کہ محمد اوران کے ساتھیوں نے ہم پر حرمت کے مہینہ میں حملہ کرکے خونریزی کی اور ہمارے اموال اور آدمیوں کو اسیر کر کے لے گئے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ماہ رجب کی آخری شب گزر جانے اور ماہ شعبان کی اول ساعت آجانے کے بعد ہی ایسا کیا تھا۔ یہود نے سنا تو انہیں بھی مسلمانوں پر حرمت والے مہینے کا الزام دینے کا موقع مل گیا تاکہ مسلمانوں کے خلاف فتنہ کی آگ بھڑکائی جاسکے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ..(۲: ۲۱۷)

اے! پیغمبر لوگ پوچھتے ہیں جو مہینہ حرمت کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اس میں لڑائی کرنا کیسا ہے؟ ان سے کہہ دو! اس میں لڑائی کرنا بڑی برائی کی بات ہے مگر (ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو) کہ انسان کو اللہ کی راہ سے روکنا (یعنی ایمان اور خداپرستی کی راہ) اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام نہ جانے دینا نیز مکہ سے وہاں کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بڑی برائی ہے اور فتنہ (یعنی ظلم وفساد) قتل سے بڑھ کر ہے۔ اور (یاد رکھو) یہ لوگ تم سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں دین سے برگشتہ کردیں۔

حضرت عبداللہ بن جحش کا گشتی دستہ

اس کے نتائج اور آیت مذکورہ "یسئلونک عن الشھرالحرام" (۲:۲۱۷) کا نزول اسلام کا ایسا انداز سیاست پیش کرتا ہے جس سے انسانی زندگی کی رفعت مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہے۔ یہ زندگی کے مادی وروحانی دونوں پہلوؤں کا توازن قائم رکھنے میں ہماری رہبری کرتا ہے۔

قرآن مجید نے مشرکین مکہ کے اس گلہ کو حق بجانب قرار دیا ہے کہ ''حرمت کے مہینوں میں جنگ

---

[۲۳] السیرۃ النبویۃ، ج ۲/ص ۲۴۵

وجدال حرام ہے''، لیکن قرآن مجید کو خود مشرکین سے جو شکوہ ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ جس گناہ کا شکوہ تمھیں ہے کچھ گناہ اس سے بھی تو زیادہ گھناونے ہیں مثلاً:

۱۔ انسان کو اللہ کی راہ سے باز رکھنا؟

۲۔ خود کفر پر جمے رہنا؟

۳۔ زائرین کو کعبہ کی زیارت سے منع کرنا؟

۴۔ لوگوں کو ان کے وطن سے نکال دینا؟

۵۔ لوگوں کو طرح طرح کے ظلم وجور سے ان کے دین سے برگشتہ کرنا!

یہ تمام گناہ مذکورہ صرف حرمت کے مہینوں میں ہی نہیں بلکہ تمام مہینوں میں حرام اور ظلم کے مترادف ہیں۔ قریش جو اس وقت عرب کے گھر گھر میں یہ منادی کررہے تھے کہ ''مسلمانوں نے حرمت کے مہینے میں قتل وغارت کا ارتکاب کیا!'' ان کو دعوت دی گئی کہ وہ بھی اپنا محاسبہ کریں کہ انھوں نے حرمت کے مہینوں میں مسلسل تیرہ سال تک مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے کون سا ظلم اٹھا رکھا؟ کیا مشرکین اور قریش کے لیے دوسروں کو دین کی وجہ سے ستانا مباح ہے؟ اور خود انھیں کفر پر قائم رہنے کا حق حاصل ہے؟ کیا مسجد الحرام کے پاسبانوں کو ان کے گھروں سے نکال دینا ان کے لیے درست ہے؟ کیا مسلمانوں پر دین کی وجہ سے کھانا پینا حرام کردینا ان کے نزدیک صحیح اور درست ہے؟ وہ شخص کیوں کر مجرم ہوسکتا ہے جو حرمت والے مہینوں میں ان قریش ومشرکین کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جو خود انھوں نے دوسروں کے ساتھ روا رکھا؟ سب سے بڑا گناہ تو یہ تھا کہ کسی حرمت والے دن میں ایسے لوگوں کو نہ ستایا جاتا جن کے دلوں میں دوسروں کے ساتھ برائی کرنے کا ارادہ تک نہ ہو۔

بلاشبہ فتنہ برپا کرنا ارتکاب قتل سے زیادہ برا ہے مگر جو قوم دوسروں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے میں آگے بڑھے تو اس کے خلاف جنگ کرنا واجب ہے اور ایسی جنگ خدا کی راہ میں متصور ہوگی اور اس لیے واجب ہوگی کہ تاکہ خدا کا دین فتحیاب ہوجائے!

مستشرقین اور منادین مسیحیت کی دہائی

اس آیت (یسئلونک عن الشھرالحرام قتال فیہ: ۲: ۲۱۷) کو سامنے رکھ کر مسیحی اہل استشراق اور مبلغین نے دوہائی مچادی کہ ''اسلام جہاد کی دعوت دیتا ہے اور دین پھیلانے کے لیے جنگ کو ضروری

سمجھتا ہے'' مسیحی حضرات کا وہی پرانا حربہ ! کہ :''اسلام تلوار کے زور سے اپنا سکہ منوانا چاہتا ہے''۔
مسیحیت کا اعتراض ہے کہ آپ ﷺ نے دین پھیلانے کے لیے تلوار کا استعمال کیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اسے چھوا تک نہیں ! جن کا دامن مذہبی حملوں اور ایسی جنگوں سے ہمیشہ پاک رہا جنھوں نے خود بھی سلامتی کو اختیار کیا اور دوسروں کے لیے بھی سلامتی ہی کو روا رکھا ! صلح و آشتی جن کا قومی نعرہ ہے اور انسانیت کے درمیان خدا اور سیدنا مسیح کے واسطہ سے اخوت کا پیوند قائم رکھنا ہمیشہ سے جن کا دستور رہا ہے۔ قرآن مجید ان کے اعتراض کی تردید ان لفظوں میں کرتا ہے :

لا اكراه فى الدين۔ قد تبيّن الرشد من الغى (۲/۲۵۶)(دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے الگ ہو چکی ہے)۔

وقاتلوا فى سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا إن الله لايحب المعتدين(۲ : ۱۹۰)(اور (دیکھو) جو لوگ تم سے لڑائی لڑ رہے ہیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی ان سے لڑو (پیٹھ نہ دکھلاؤ) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں !)

قرآن میں بے شمار آیات کریمہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ دین اسلام کے اقبال و قبول میں اکراہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جنگ کرنا انہی کے ساتھ روا ہے جو مسلمانوں کو ان کے دین سے روکیں اور ان میں مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جہاد اور مقاتلہ صرف عقیدے کی آزادی کے حصول کے لیے جائز ہے یعنی جہاد سے مقصود وہ دفاعی وسائل ہیں جو عقیدے کی حفاظت کے لیے مستعمل ہیں۔

اس سے یہی مترشح ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے عقیدے سے رشوت، پریشر یا تعذیب سے قطع نظر صرف دلیل و حجت اور منطق سے ہٹانے کی کوشش کی جائے تو مقابل کو حق حاصل ہے کہ ایسے شخص کو صرف منطق و دلیل سے جواب دے۔

لیکن اگر کسی شخص کو عقیدہ سے ہٹانے کے لیے جنگی قوت، تخویف اور تعذیب کا سہارا لیا جائے تو اس کا جواب بھی اسی کے مثل ہوگا، کیوں کہ انسان کی شرافت و بزرگی عقیدے کی پرتو ہے اور جو شخص انسانیت سے واقف ہے تو اس کے نزدیک عقیدے کی حفاظت جاہ و منصب، مال و ثروت اور جان سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

انسان اور حیوان دونوں ہیں ذی روح ہونے کی وجہ سے مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ خورد و نوش، نشو و نما اور تحفظ جاں میں دونوں کے احساسات برابر ہیں، لیکن عقیدہ جسے صرف معنوی درجہ حاصل ہے اس

میں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ مربوط ہے اور یہی عقیدہ انسان اور خدا کے درمیان وجہ ربط ہے اور اسی عقیدے کی بناپر انسان کو حیوان پر تفوق حاصل ہے۔ عقیدہ ہی کی بناپر انسان جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان دوسروں کی ضروریات کو اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر ترجیح دینے میں خوشی محسوس کرتا ہے کیوں کہ اس تعلق و ربط سے انسان خدا وحدہ لاشریک کی خوشنودی اور قربت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

جب انسان کا عقیدہ اس کی روح میں حلول کر جائے تو ہزارہا شدائد و مظالم کے باوجود اس کے عقیدے کو بدلنا مشکل ہو جاتا ہے، اسے تمام سختیاں برداشت ہیں لیکن وہ اپنے عقیدے کو کبھی ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے آباء واجداد کو دیکھتے ہیں جنھوں نے ہر قسم کے مظالم برداشت کئے لیکن صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا اور عقیدے کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔[۲۴]

اسلام کی بنیاد اوہام اور خیالی عقائد پر نہیں ہے، نہ ہی وہ انسان کو انفرادی زندگی گزارنے کا درس دیتا ہے بلکہ وہ دین فطرت ہے جس کی پیروی واتباع فرد واحد اور جماعت دونوں کے ذمے عائد ہوئی ہے۔ اسلام ایک مسلمہ حقیقت اور طبعی استقلال پر قائم ہے۔ اسلام نہ ہی جنگ و جدال پر ابھارتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر اس سے روکتا ہے بلکہ انسانیت کے احترام میں جنگ کو نرم کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ انسان کو نیکی اور کمال حاصل کرنے کا پورا موقع مل سکے اور وہ فکر و تدبر کو بروئے کار لا سکے۔ جنگ کو نرم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام صرف دو حالتوں میں جنگ کی اجازت دیتا ہے:

۱- انسانیت کی حفاظت کے لیے۔　　۲- عقیدے کی حفاظت کے لیے۔

اسلام نے جس قسم کے جہاد کو قائم رکھا اور جس کی تلقین قرآن نے کی ہے یہی جنگ ہے۔[۲۵]

محمد ﷺ کی زندگی ایک جامع ومانع اور مکمل درس ہے، یہ جاذبیت اور حکمت و دانائی سے پر ہے۔ آپ ﷺ بعثت سے قبل بھی صداقت و شرافت اور نجابت میں ضرب المثل تھے، نبوت کے بعد ان کمالات کے ساتھ وحدانیت کی تعلیم نے آپ کی شخصیت کو مزید نکھارنے میں مدد دی۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ انسانیت کے فلاح و بہبود کے لیے قربان تھا۔ اس پر یہ امتیاز کہ اگر کسی نے جاہ و حشمت اور مال

---

[۲۴]۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ﷺ، ص ۲۵۲-۲۵۱

[۲۵]۔ ماخذ سابق، ص ۲۵۴

ودولت کی جھلک دکھا کر آپ کو حقیقی وروحانی زندگی سے ہٹانا چاہا تو آپ نے اس کی طرف کبھی بھی دھیان نہیں دیا۔

آپ ﷺ جس بلند مقام ومرتبہ پر فائز تھے کسی دوسرے انسان کو وہاں تک رسائی ملنی ناممکن ہے۔ یہ کمالات زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ حیات کے ہر زاویے میں یہی تکمیل دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ ﷺ کی صداقت ونبوت ابھی تک جاری ہے اور تاقیامت باقی رہے گی۔، آپ کے بعد کئی بلند ہستیاں منظر عام پر آئیں، جنھوں نے انسانیت اور صداقت کا درس دیا لیکن ان کے دروس واعمال نے وقتی اثر ڈالا کیوں کہ ان میں سے کسی کو نبوت ورسالت من جانب اللہ نصیب نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ سے پہلے نبوت ورسالت اس قدر عام تھی کہ ہر قوم میں ہادی وداعی بھیجے گئے مگر ان بے شمار انبیاء میں سے نہ تو کسی نے خود کو تمام دنیا کے لیے پیش کیا نہ کسی نے اپنی ختم رسالت کا اعلان کیا سوائے محمد ﷺ کے، جنھوں نے اپنی رسالت کا دعوی تمام عالم کے لیے تاقیامت پیش کیا اور اہل بصارت وبصیرت نے دعوت حق کی تصدیق کی کیوں کہ نہ آپ کی رسالت نیا دستور اور جدید آئین تھا اور نہ ہی آپ پر نازل شدہ تعلیمات نئی تھیں بلکہ انبیاء سابقین نے آخر الزماں ﷺ کے آنے کی بشارت دی تھی:

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ..(۱۲/۱۱۱)

(یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات تو ہے نہیں بلکہ جو (آسمانی کتابیں) اس کے نزول سے پہلے (موجود) ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت اور رحمت ہے۔)

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَى مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۰/۳۷)

اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ (کی وحی) کے بغیر (اپنے ہی سے) گھڑ لیا گیا ہو۔ بلکہ یہ تو (ان کتابوں کی) تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے قبل (نازل) ہوچکی ہیں اور کتاب (احکام ضروریہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے اس میں کوئی بات شک کی نہیں کہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

یہ محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیاۃ محمد'' کی ہلکی سی جھلک تھی۔ اتنے سالوں کے بعد بھی اس کتاب کی افادیت باقی ہے اور آج بھی دشمنان اسلام کے باطل پروپیگنڈے کے توڑ کے لئے اس کتاب میں کافی مواد موجود ہے۔

جنوبی ہند میں اتحاد بین المسلمین
کے تاریخی شواہد

ڈاکٹر راہی فدائی

na_qasmi@yahoo.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: " یا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ" (سورۂ حجرات ۴۹: آیت ۱۳) **(اے لوگو بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قومیں اور مختلف قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں شریف ترین شخص وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور بہت باخبر ہے)۔**

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مختلف قبیلے اور خاندان بنائے اور رُخ بہ رُخ، رنگ و نسل کے لوگوں کی تخلیق فرمائی اور اپنی قدرت کی صناعی دکھائی تاکہ جب بھی ابن آدم باہم ملاقات کریں تو خدا کی کرشمہ سازی و حسن کاری کو دیکھ کر اپنے دل و دماغ میں جذبۂ ایمان کو فروغ دیں اور اس کی قدرت کاملہ پر یقین کامل پیدا کریں۔ اگر انسانی معاشرے میں اس طرح کے خیالات و احساسات عام ہو جائیں تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و انسیت اور مروت و مودّت کا ماحول نظر آئے گا جس سے امن و امان اور سکون و اطمینان کی راحت بخش فضا میسر آئے گی۔ خداوند قدوس نے انسانوں کے فلاح و بہبود کے لئے عمومی طور پر متعدد ذوات اور متنوع تشخصات کے پیدا کرنے کی حکمت و مصلحت کا اظہار فرمایا۔ یہی بات خصوصی طور پر مسلمانوں کے حق میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان میں جو مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے افراد ہیں ان کے آپسی تال میل اور ملاقاتوں کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے کہ ان میں رقابت کے بجائے رفاقت کا جذبہ جنم لے اور اللہ کے رسول ﷺ کے تمام امتی اس اختلافِ ذوات و صفات کو خدائے تعالیٰ کی تخلیقی تقدیس کی بوقلمونی سمجھ کر اس کی ثناخوانی میں رطب اللسان ہو جائیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا "واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا" (آل عمران ۳: آیت ۱۰۳) (اے مسلمانوں اللہ تعالیٰ کی رسی کو تمام مل کر مضبوطی سے تھامے رہو، اتحاد و اتفاق قائم رکھو اور نا اتفاقی کا مظاہرہ مت کرو۔)

جس طرح مسلمانوں کی قومیتوں میں اور ملکی وعلاقائی نسبتوں میں تنوع و تعدد موجود ہے، اسی طرح ان کے افکار و اذکار میں بھی نیرنگی و تلون پایا جاتا ہے۔ یہ بھی خدائے تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کا تقاضا ہے مگر باوجود اسکے اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان باہم اخوت و مروت سے رہیں اور اپنی یکجہتی و دین داری کا ثبوت دیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنج وقتہ اور عیدین کی نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حج کے موقعے پر تمام فرزندان اسلام کے لئے ایک ہی نصاب عمل مقرر کیا گیا ہے، حالانکہ حج کے مقدس و منور ایام میں شرکت کرنے اور ایک جگہ جمع ہونے والے حجاج کرام متعدد ملکوں، مختلف قوموں اور گونا گوں نسلوں اور رنگوں سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے افکار و خیالات میں بھی فرق نمایاں رہتا ہے۔ تاہم اسلام کا منشاو مقصد یہی ہے کہ اس فکری و دینی کثرت کے باوجود مسلمانوں کی عملی و قلبی وحدت کا نقشہ اہلِ جہاں پر واضح ہو اور خود مسلمان اس سے مستفید ہوں۔ یہ اتحاد و اتفاق خالق کائنات کی عطا کردہ عظیم نعمت ہے جس کی قدر دانی اور شکر گزاری ہر مسلمان پر ضروری ہے۔

گزشتہ چند ماہ پیشتر اردو اخباروں میں ایک انتہائی خوش کن خبر سرخیوں کی زینت بڑھا رہی تھی۔ وہ یہ ہے کہ ملک کے دو مختلف و متضاد و مکاتب فکر کے حامل باوقار ذمہ دار حضرات یکجا ہو کر امت مسلمہ کے لئے اتحاد و اتفاق کا پیغام سنا رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ بریلی مسلک کے قائد خانوادۂ اعلیٰ حضرت علامہ احمد رضا خانؒ صاحب کے نبیرہ و چشم و چراغ مولانا توقیر رضا خان صاحب، صدر آل انڈیا اتحاد و ملت کونسل نے دیوبندی مسلک کے سرپرست حجۃ الاسلام علامہ محمد قاسم نانوتویؒ کی قائم کردہ عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند پہنچ کر ذمہ داران دارالعلوم سے ملاقات کی۔ مہتمم و اساتذۂ کرام نے مولانائے موصوف کا پرجوش استقبال کیا اور مہمان مکرم سے قوم و ملت کو درپیش سنگین مسائل پر تبادلہ خیال کیا اور اپنے صحافتی بیان میں تمام مسلمانوں کو بالخصوص اہل علم کو تلقین کی کہ موجودہ دور میں وہ اپنے اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر دشمنانِ اسلام کے مقابلہ کے لئے متحد اور سرگرم ہو جائیں۔ اس توضیحی بیان کے بعد اتحاد کے معنی و مفہوم کو مثالوں کے ذریعہ پیش کیا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اتحاد دراصل اختلافِ آرا کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کی رائے کے احترام کرنے اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ اتحاد کی ضد افتراق ہے جس میں تحمل و برداشت مفقود ہوتا ہے، جس سے کدورت و عداوت کو شہ ملتی ہے اور دوستوں کے درمیان رنجشیں پیدا ہوتی ہیں۔ افتراق کا مترادف اختلاف نہیں بلکہ ''خلاف'' ہے۔ یہ اس لئے کہ لوگوں کی منزل ایک ہو مگر راستے الگ الگ ہوں اسے اختلاف کہتے ہیں۔ اس کے برعکس منزل بھی جدا جدا ہو اور راستے بھی علیحدہ علیحدہ ہوں تو

اسے اصطلاح خواص میں ''خلاف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعر نے ''اتحاد'' کے مفہوم اور اس کے ثمرات کو کس خوبی سے اپنے شعر میں پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو:

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حروف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

یعنی دوجہاں کی راحت وطمانیت زیست ان دوکلمات کی تشریح پر عمل کرنے میں ہے: ایک دوستوں کے ساتھ لطف ومہربانی سے پیش آئیں اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ رواداری برتیں، ان سے صلح کرلیں اور ان کی رعایت کریں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ قائدان قوم، اصحاب علم و فضل اور اہلِ دانش وبینش کا مجمع عام کے خطابات میں اور صحافتی بیانات میں ''اتحاد'' کا نعرہ لگانا کافی نہیں ہے بلکہ انہیں اپنے خواص کی محفلوں اور خلوتوں میں بھی دیگر مسالک کے سرپرستوں اور اپنے مخالفین پر طنز کرنے اور انہیں نازیبا الفاظ سے یاد کرنے کی روایت ترک کرنی ہوگی۔ ہمیں علم ہے کہ بعض اہم شخصیتیں جن کے علم و عمل کا قوم میں اعتبار کیا جاتا ہے جب وہ اتحاد واتفاق کے موضوع پر منعقد جلسے سے خطاب کرنے کے بعد نجی اور بے تکلف محفلوں میں پہنچ کر گفتگو کرتی ہیں تو برسرِ محفل جن کی تعریف وتوصیف کی تھی، انہیں کو ہدف تنقید کرنے اور ان سے اپنی برأت کا اعلان کرنے میں تکلف و توقف نہیں کرتی ہیں۔ یہ حقیقی اتحاد کی خواہش کے سراسر خلاف اور نیتوں میں کھوٹ کی بیّن دلیل ہے۔ اس سے احتراز لازمی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے بعض معروف مدارس میں دیگر مسالک کے خلاف مقابلہ آرائی کیلئے طلبہ کو تقریر و تحریر کے ذریعہ تیار کیا جاتا ہے۔ دیوبندی مکتب فکر کے جامعات میں بریلویت ورضاخانیت کے خلاف اور بریلی مکتب فکر کی درسگاہوں میں دیوبندیت کے خلاف اور دونوں طرح کے دارالعلوم میں وہابیت ونجدیت کے خلاف باقاعدہ محاضرات ومذاکرات کی انجمنیں سجائی جاتی ہیں۔ اتحاد وملت کے لئے مذکورہ ناپسندیدہ روش کو ترک کرنا ہوگا اور طلبہ کے ذہن ودل میں یہ بات بٹھانی ہوگی کہ انہیں اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے بھی دیگر مسلکوں کے معتقدات و معمولات کو برداشت کرنا ہوگا اور مخالفین پر لعن وطعن کرنے سے خود کو بچانا ہوگا اور یہی معاملہ اہل السنۃ والجماعۃ اور اہل تشیع کے درمیان کا ہے۔ شیعہ اور سنی مذاہب کے علماء وفضلا حضرات آل انڈیا سطح کی تنظیموں کے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو باہم شیر وشکر کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ مگر جب یہی معززین اپنے خاص حلقوں میں ہوتے ہیں تو ان کا رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ان میں خوفِ خدا کی کمی ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ''ان اکرمکم عند اللہِ اتقکُم'' ہمیشہ مستحضر

ہونا چاہئے، اس کے بغیر اتحاد واتفاق ممکن نہیں۔ اس موقع پر اخوت و یکجہتی کے دو غیر معمولی تاریخی واقعات عبرت و نصیحت کے لئے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شہر ویلور (موجودہ تامل ناڈو) مغل شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیبؒ کے دورِ اقتدار میں بیجاپور کرناٹک پائیں گھاٹ کے زیر انتظام تھا۔ اس زمانے میں کرناٹک کا پایہ تخت آرکاٹ ہوا کرتا تھا۔ آرکاٹ کے حکمران نواب صفدر علی خان نائطی (متوفی ۱۱۵۵ھ ۱۷۴۲ء) بن نواب دوست علی خان نائطی نے مشہور دکنی شاعر ولیؔ ویلوری (مصنف روضۃ الشہداء) کے برادر زادے اور اپنے استاذ میر اسداللہ خان جاگیر دار ''چت پیٹ'' کو آرکاٹ کی وزارت عظمیٰ پر فائز کیا تھا۔ نواب میر اسداللہ مسلکاً شیعہ ہونے کے علاوہ دیندار اور نمازی بھی تھا۔ ایک مرتبہ کسی سفر کے دوران اس کا گزر ویلور کے مضافات سے ہوا۔ اتفاقاً نمازِ عصر کا وقت تھا۔ اس نے مسجد دریافت کی۔ مصاحبین نے کہا کہ مسجد شہر میں ہے۔ اس نے تنگیٔ وقت کی وجہ سے میدان ہی میں نماز ادا کی اور وہاں مسجد بنانے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ اس جگہ مسجد تعمیر ہوگئی۔ بعد میں اس مسجد کے اطراف سنی حضرات نے گھر بسالئے اور وہاں ان کی آبادی ہوگئی۔ شہر میں واقع شیعہ اور سنیوں کے مشترکہ محلے میں سنیوں کی مسجد پہلے ہی سے تھی۔ نواب صاحب کے حکم پر نئی تعمیر شدہ مسجد کے اطراف آباد سنی حضرات پنج وقتہ نمازوں کے لئے شہر کی سنّی مسجد کا رُخ کیا کرتے تھے، ادھر شہر میں موجود شیعہ حضرات کی آبادی کیلئے کوئی مسجد شہر میں نہیں تھی۔ جب نواب اسداللہ خان کی ایماپر مسجد بن گئی تو یہ لوگ اپنی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے شہر سے دور اس میدان کی طرف چل پڑتے اور وہاں پہنچ کر نماز ادا کرتے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر دونوں مسلکوں کے ذمہ داروں کے ذہنوں میں بتوفیق الٰہی یہ بات آئی کہ کیوں نہ ہم آپس میں مسجدوں کا تبادلہ کرلیں۔ پھر باتفاق آراسے ''بڑے علی پورا'' میں واقع سنیوں کی مسجد شیعہ حضرات کے حوالے کی گئی اور شہر کے فرازی میدان میں موجود شیعہ حضرات کی مسجد (ٹیک کی مسجد، موجودہ مکہ مسجد) سنیوں کے حوالے کردی گئی۔ الحمدللہ اب ویلور شہر بہت وسیع ہوچکا ہے اور مذکورہ دونوں مسجدیں شہری آبادی کا حصہ بن چکی ہیں مگر آج بھی اس قدیم معاہدے پر عمل الحمدللہ جاری ہے۔

حقیقی اتحاد کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم ترین و اولین ام المدارس جامعہ باقیات صالحات، ویلور (تامل ناڈو) (قائم شدہ: ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء) کے مؤسس و بانی اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری و نقشبندیؒ (متوفی ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء) خلیفہ اعلیٰ حضرت قطب ویلورؒ و حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ و حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ نے مدرسہ باقیات کی توسیع کے لئے اس کے اطراف

آباد محلہ والوں سے مشورہ کیا۔ جس سمت توسیع ہونی تھی اتفاقاً وہاں شیعہ حضرات کے مکانات تھے۔ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کرکے اپنے گھر بخوشی مدرسے کے سپرد کردیے، جہاں مدرسہ کی جدید عمارت تعمیر کی گئی اور اس کا شاندار افتتاح اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمۃ کے وصال کے بعد ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ شیعہ حضرات کے اس ایثار و قربانی کے مد نظر بانی علیہ الرحمۃ نے مدرسے کے دستور میں اہل السنہ واہل تشیع دونوں کے داخلے کی گنجائش رکھی۔ ہندوستان بھر ہی میں نہیں بلکہ برصغیر کے کسی بھی مدرسہ یا دارالعلوم میں اس طرح کی یگانگت اور رواداری کا قانون پایا نہیں جاتا۔

علاوہ ازیں عام مسلمانوں میں رواداری خصوصاً طبقۂ علما میں حقیقی اتحاد کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔ راقم الحروف (راہی فدائی) کے شفیق استاذ و مربی و مرشد شیخ التفسیر علامہ سید شاہ عبدالجبار صاحب قادری باقویؒ، سابق مہتمم و ناظر جامعہ باقیات صالحات ویلور (متوفی ۱۴۲۴ھ ۲۰۰۳ء) ویلور کی مسجد شاہ علی سلطان کے امام و خطیب تھے۔ حضرت قبلہ کے دوستوں میں اہلِ حدیث مسلک کے حامل جامعہ دارالسلام عمرآباد (قائم شدہ ۱۹۲۴ء) کے استاذ مولانا ابوالبیان حماد صاحب عمری (متوفی ۲۰۲۳ء) بھی تھے۔ ایک روز مولانا حماد صاحب اچانک جمعہ کی نماز کے قریب مسجد شاہ علی سلطان تشریف لائے۔ شاید آپ کہیں سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔ حضرت خطیب صاحب قبلہ نے مولانا کو دیکھ کر فرمایا: مولانا آج آپ جمعہ کا خطبہ دیں گے اور نماز پڑھائیں گے۔ مولانا حماد صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے تاہم آپ نے پیش کش قبول فرمائی اور دریافت کیا کہ اس مسجد کے معمولات کیا ہیں۔ حضرت نے فرمایا منبر پر اردو اور عربی خطبہ ہوگا اور نماز کے بعد فاتحہ خوانی و دعائے ثانی ہوگی۔ مولانا نے بہترین خطبہ دیا اور اسی طرح عمل کیا جس طرح کا معمول تھا اور پھر وہاں سے اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔ دعا کے بعد مسجد کی آفس میں خطیب مسجد حضرت سید شاہ عبدالجبار صاحب، مسجد کی کمیٹی کے صدر سکریٹری اور دیگر ارکان کیساتھ تشریف فرما ہوئے تو صدر صاحب نے حیرت سے کہا حضرت میں جمعہ میں انتہائی پریشان ہوگیا تھا کہ مولانا حماد صاحب کہیں رفع یدین وغیرہ نہ کر بیٹھیں، مگر علمائے حق تو واقعی ان چیزوں سے بہت بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ بات آج ثابت ہوگئی۔

''حقیقی اتحاد'' کے لئے ضروری ہے کہ اہل علم و اصحاب فضل اپنے اختلافات علمیہ کو عوامی سطح پر نہ لے آئیں، ایک دوسرے کی تکفیر کرنے اور آپس میں بدعات کا تبادلہ کرنے کا ہنر نہ اپنائیں بلکہ رواداری و تحمل و برداشت جیسی صفات عالیہ سے اپنی شخصیت سازی کریں۔ کسی بھی اختلافی مسئلے میں تحقیق کے بغیر فتویٰ صادر نہ فرمائیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سن ۱۹۷۵ء کی بات

ہے جبکہ راقم مدرسہ باقیات میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا، انہیں دنوں ویلور کے تین سو سالہ قدیم خانقاہی مدرسہ دارالعلوم لطیفیہ میں شہر مبارک پور (یوپی) سے تشریف لائے ہوئے ایک نوجوان استاذ مولانا نعیم اختر قادری کا تقرر ہوا جو جامعہ اشرفیہ کے فارغ و فاضل اور بااخلاق و باصلاحیت شخص تھے۔ جب موصوف سے راقم کی ملاقاتیں ہونے لگیں تو دوستی اور بے تکلفی ہوگئی۔ ہم نے موصوف سے علمی گفتگو کے دوران مولانا اسماعیل شہیدؒ (متوفی ۱۲۴۶ھ) کا ذکر چھیڑا تو انھوں نے ہم سے اختلاف کیا۔ ہم نے کہا کہ جس کتاب کو لے کر مولانا اسماعیل شہیدؒ کو برا بھلا کہا جاتا ہے وہ اختلافی و نزاعی کتاب یعنی ''تقویۃ الایمان'' بقول شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۸۷۹۔۱۹۵۷ء)، مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ وہ کتاب ان کی طرف منسوب کردی گئی ہے (نقش حیات، مکاتب شیخ الاسلام) پھر راقم نے مولانا موصوف کو مولانا اسماعیل شہیدؒ کی عربی تصنیف ''عبقات''، جس کا موضوع تصوف ہے، مطالعہ کے لئے دی۔ مولانا نے ''عبقات'' پڑھنے کے بعد فرمایا: یقیناً یہ مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تصنیف ہے اور اس کا مصنف ''تقویۃ الایمان'' کا مصنف ہو ہی نہیں سکتا۔

''حقیقی اتحاد'' قائم ہونے کے لئے حضرات علماء و قائدین قوم کا سختی سے اس بات پر عمل کرنا ضروری ہے کہ اپنی خصوصی مجلسوں میں احترام انسانیت کی بنیاد پر مخالفین پر طعنہ زنی و بدگوئی سے خود کو بچائے رکھیں۔ یہ وقت کا تقاضا ہی نہیں شریعت کا منشا بھی ہے۔ اس کی مثال کے طور پر یہ چشم دیدہ واقعہ چشم کشا ہوگا۔ صوبہ کیرالا کے جید عالم دین واستاذ العلماء علامہ اے پی محمد ابو بکر صاحب باقوی مسلیار نے کالیکٹ کے قریب ایک اسلامی یونیورسٹی ''مرکز الثقافۃ السنیۃ'' قائم کی جس میں ہزاروں کی تعداد میں تشنگان علم ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے حاضر ہوکر سیراب و فیض یاب ہورہے ہیں۔ چند سال پیشتر راقم نے مولانا ابو بکر باقوی کی دعوت پر جلسہ دستار بندی میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ اس موقع پر عرب و عجم کے کئی مشاہیر علماء مدعو تھے، جن میں بریلی مسلک کے مقتدر و جید عالم اور سیاسی قائد مولانا عبید اللہ اعظمی بھی تشریف رکھتے تھے۔ جلسے سے ایک روز پیشتر اردو دان طلبہ نے، جن میں شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے طلبۃ العلوم کی کثرت تھی، راقم اور مولانا عبید اللہ خاں اعظمی صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک پروفیسر صاحب کو مذکورہ خصوصی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم تینوں جلسہ گاہ پہنچنے کے لئے سیڑھیاں طے کر رہے تھے تو اوپر کی منزل سے نظم خوانی کی آواز سنائی دی۔ جب قریب پہنچے تو ہم نے اس نظم خواں کی زبانی دیوبندیوں پر اپنے اشعار میں طنز کرتے ہوئے سنا۔ راقم کو بہت برا معلوم ہوا، دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ ان نوجوان علماء کی اصلاح بہر حال کرنی

ہے۔ خیر جب جلسہ شروع ہوا تو تقریر کا اولین موقع مولانا عبیداللہ خاں اعظمی کو دیا گیا۔ مولانا نے حمد وصلوۃ کے بعد اپنے خطاب میں بڑے ہی زوردار الفاظ میں ان طلبہ کی تنبیہ فرمائی۔ اس طرح کے اشعار پڑھنے سننے سے منع فرمایا اور پھر کہا کہ آپ لوگوں نے اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب کو جاہلوں کا امام و پیشوا بنادیا ہے حالانکہ امام رضا اہل علم و فضل کے قائد ور ہنما تھے۔ دیوبندی مکتبہ فکر کے مختلف مدارس میں ''فتاوائے رضویہ'' کا بڑے احترام وادب کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا کی نصیحت سے راقم کو اطمینان ہوا اور دل میں امید جاگی کہ ''حقیقی اتحاد کی راہ ان شاءاللہ ہموار ہو جائے گی۔

غرض حاصل کلام یہ ہے کہ جس طرح ہم اپنی عوامی تقریروں میں اتحاد بین المسلمین کی پرجوش وکالت کرتے ہیں، اسی طرح حقیقی اتحاد کے لئے بھی بصمیم قلب کوشاں رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسنِ توفیق سے نوازے اور ہماری ہر صحیح کوشش کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

تیتو میر کی مذہبی اور سیاسی خدمات

محمد لعل چاند شیخ

(ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ)

mdlalchand.jmi@gmail.com

سید میر نثار علی جو تیتو میر کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ۲۷ جنوری ۱۷۸۲ء کو گاؤں چاند پور[۱] قصبہ حیدر پور، ضلع ۲۴ پر گنہ میں پیدا ہوئے تھے۔[۲] ان کے والد کا نام میر حسن علی تھا۔ ان کے جد امجد سید عبداللہ مغلیہ حکومت کے تحت جعفر پور کے ''میر انصاف'' کے عہدے پر فائز تھے۔ اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ میر لگایا کرتے تھے۔[۳] والدہ کا نام عابدہ رقیہ خاتون تھا۔[۴] تیتو میر کے چار بھائی بہن تھے۔[۵] والدہ کی خواہش کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ مدرسے میں اردو، فارسی، عربی اور بنگلہ زبانوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے فقہ، حدیث، ریاضی، فلسفہ اور منطق وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو قرآن مجید حفظ کرنے کا خیال آیا اور انھوں نے ۱۸ سال کی عمر میں حفظ قرآن بھی مکمل کیا۔ ۲۰ سال[۶] کی عمر میں ان کی شادی محمد رحیم اللہ صدیقی کی بیٹی سے ہوئی۔ شادی کے بعد تیتو میر نے اپنے استاد حافظ نعمت اللہ بہاری کے ساتھ کلکتہ کا قصد کیا۔ کلکتہ میں ان کی ملاقات اس وقت کے دو معروف تاجر اور مخیر وظیفوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو عام کرنے والے جمال الدین آفندی مصری[۷] اور مرزا غلام انبیا دہلوی[۸] سے ہوئی۔[۹] ان دونوں نے تیتو میر کی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کو منتہی

---

[۱] Khan, Muhammad Mojlum, *The Muslim Heritage of Bengal*, Cube Publishing, England, 2013, p. 89.

[۲] Mallik, A. R, *British policy and the Muslims in Bengal*, Bengal Academy, Dacca, 1977 Edition 2, p. 88.

[۳] Ali, Muhammad Mohar, *History of the Muslims of Bengal*, Imam Muhammad ibn Saud Islamic University, Riyadh, 1988, V; IIB, p. 244

[۴] *The Muslim Heritage of Bengal*, p.89

[۵] چٹاپدھیہ، رودر پرتاب، نبو روپے تیتو میر (نئی صورت میں تیتو میر، بنگلہ)، امرت شرن پرکاشن، کلکتہ، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۰

[۶] *Muslim Heritage of Bengal*, p.89.

[۷] جمال الدین آفندی ایک دولتمند مصری تاجر تھے جو کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ (*History of the Muslims* of *Bengal, p. 245*)

درجات کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور ان کا خرچ خود برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ تیتومیر نے شیخ کمال بکر گنجی اور شیخ ذکی بہاری سے عربی اور اسلامی فنون میں اعلی تعلیم حاصل کی۔[۱۰]

تیتومیر اپنی ذہنی و جسمانی ساخت کے اعتبار سے ایک مضبوط شخص تھے۔ وہ دوران تعلیم کشتی بھی سیکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کلکتہ کے قیام کے دوران کشتی کے مختلف داؤ پیچ بھی سیکھے۔[۱۱] انھوں نے ۱۸۱۵ء میں کشتی کو ہی بطور پیشہ کے اپنایا۔[۱۲] مگر اس پیشہ کو بہت جلد چھوڑ کر مختلف ہندو زمینداروں کے پاس لاٹھیال کے طور پر کام کرنا شروع کیا، جہاں زمینداروں نے اپنے مفاد کے خاطر ان کو مختلف معاملات (زمینداروں کی آپسی رنجشوں) میں پھنسا کر قید کرا دیا۔[۱۳] رہائی کے بعد ان کی ملاقات دہلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے مرزا غلام انبیا سے ہوئی۔ ان کے ساتھ تیتومیر نے دہلی کا پھر حج کا سفر کیا۔[۱۴] یہ سید احمد شہید کے ذریعہ منعقد کیا گیا ایک اجتماعی حج تھا، اس میں تقریباً ۸۶۰ افراد نے ۱۵ جہازوں پر سفر کیا۔ تیتومیر نے مکہ کا سفر ۱۸۲۲ء میں کیا تھا۔[۱۵] اس قافلے میں ۱۰۷ لوگ ''مسکین'' کی حیثیت سے تھے اور انہی میں تیتومیر بھی تھے۔ تیتومیر نے حج مکمل کرنے کے بعد مسجد نبوی میں ایک طویل عرصہ قیام کیا۔[۱۶] اس دوران سید احمد شہید، مولوی عبدالحئی، شاہ اسماعیل شہید اور مولوی

---

[۸] شیخ غلام حسین بن شیخ غلام نبی معروف بہ مرزا غلام انبیا یا نبی ان کا تعلق دہلی کے شاہی خاندان سے تھا اور کلکتہ کے تجارتی حلقہ میں ''Prince of Merchants'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے ''البراهين الساباطية'' کی طباعت کے لئے اس کے مصنف جواد کو پرنٹنگ مشین خرید کر دیے تھے۔ یہ کتاب کلکتہ کے مسلم معاشرہ، عیسائی مشنریوں کی زیادتیوں اور خصوصاً تاجر حلقہ پر مشتمل ہے۔ انھوں نے کلکتہ کی ناخدا مسجد کی تعمیر بھی کرائی۔ کلکتہ میں آج بھی کئی سڑکوں اور پارکوں کے نام انکے نام پر ہے اور کئی نام تبدیل بھی کر دیے گئے ہیں۔ (*History of the Muslims of Bengal*, p.213 and 245.)

[۹] Ali, Muhammad Mohar, *History of the Muslims of Bengal*, p.245.

[۱۰] *Muslim Heritage of Bengal*, p.89.

[۱۱] سرکار، بہاری لال، تیتومیر بانز کلبیڑیار لڑائی: (تیتومیر یا نز کلبیڑیا کی لڑائی) بنگلہ پشتک بیپونی، کلکتہ ۱۸۹۷ ص: ۱۱

[۱۲] *Muslim Heritage of Bengal*, pp. 90-91

[۱۳] حوالہ سابق، نبو روپے تیتومیر، ص: ۵۳۔

[۱۴] حوالہ سابق، تیتومیر بانز کلبیڑیار لڑائی، ص: ۱۲

[۱۵] Moin-Ud-Din Ahmad Khan, *Shaheed Titumir: The Muslim Hero of Bengal*, https://archive.org/details/titumir, p.6.

[۱۶] ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی، سیرت سید احمد شہید، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنو، ۲۰۱۱ء، حصہ

وحیدالدین پھلتی وغیرہ کے درس وتدریس میں شامل ہوتے رہے۔[۱۷] اور عرب کے بعض معروف اساتذہ سے عربی اور اسلامی تعلیمات حاصل کی۔ عرب میں وہ محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء۔۱۷۹۲ء) کی تحریک اور محمد بن سعود (۱۷۱۰ء۔۱۷۶۵ء) کی سیاسی جدوجہد سے متاثر ہوئے، ان کی زبان پر ان دونوں محرکین کا نام برجستہ آجایا کرتا تھا۔[۱۸] ان کی کلکتہ واپسی ۱۸۲۷ء میں تقریباً پینتالیس سال کے عمر میں ہوئی۔[۱۹] کلکتہ آتے ہی انھوں نے بنگال میں سیاسی و مذہبی قیادت کا فریضہ انجام دیا اور تقریباً چار سال اس کام میں لگے رہے۔ تیتو میر لگ بھگ چار سال دینی و سیاسی خدمات کے بعد انگریزی فوجوں کے ہاتھوں جنگ کے دوران ۱۷ نومبر ۱۸۳۱ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔[۲۰]

مذہبی اصلاح اور تحریک طریقہ محمدیہ

مکہ میں تیتو میر نے اسلام کو اس کے اصل مصادر و مراجع سے پڑھا اور سمجھا تھا۔ اس تعلیم نے نہ صرف ان کے ایمان و عقیدہ کو جدت بخشی، بلکہ تہذیب و تمدن کے لیے بھی ان کا نظریہ تبدیل کر دیا۔ وہ جس معاشرہ میں پلے بڑھے تھے، اس میں وہ مسلمانوں کو ہندو عقائد و نظریات اور تہذیب و تمدن کی اتباع کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔[۲۱] لہٰذا انھوں نے دیگر مصلحین کے مانند مسلمانوں کو قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دعوت دی اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک تحریک کی بنیاد رکھی جسے "طریقہ محمدیہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔[۲۲] یہ تحریک عوام و خواص کو خالص قرآن و سنت کی جانب دعوت دینے والی تحریک تھی۔ اس کی جڑیں ۱۸ ویں صدی عیسوی میں پیدا ہونے والی عظیم شخصیت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) کی تحریک میں پیوست نظر آتی ہیں۔ اس تحریک کو شاہ ولی اللہ کے نواسہ شاہ اسماعیل شہید (۱۷۷۹ء۔۱۸۳۱ء) اور شاہ عبدالعزیز کے شاگرد سید احمد شہید

اول، ص: ۳۴۳۔۳۴۴۔

[۱۷] ماخذ سابق ص: ۳۶۵۔

[۱۸] سیف اللہ، تیتو میر (بنگلہ)، پرکاش کال، ملن اتسو، کلکتہ، ۲۰۲۰ء ص: ۱۳

[19] *The Calcutta Review*, vol: c/100, Baham, ITIT, L, & CO., London, 1870, p. 82.

[20] *The Muslim Heritage of Bengal*, pp. 92-93.

[۲۱] حوالہ سابق، تیتو میر بانز کلبیڑیار لڑائی، ص: ۱۶

[22] *The Muslim Heritage of Bengal*, pp. 91-92

(۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) نے فروغ دیا تھا۔ البتہ موٴخرالذکر کا کردار زیادہ اہم تھا۔

تاریخی کتابوں میں وہابی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب اور طریقۂ محمدیہ کو ایک ہی سمجھ لیا گیا ہے۔[۲۳] ولیم ہنٹر نے بھی ایسا ہی سمجھا ہے۔ اس کے خلاف کلکتہ میں ۱۸۷۰ء میں طریقۂ محمدیہ کے پیروؤں نے ان کو ''وہابی'' کہے جانے پر اعتراض کرتے ہوئے احتجاج کیا اور اپنے آپ کو صرف سنی کہنے کو کہا۔ اس سلسلے میں سید احمد کے پیروؤں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں مشہور مقدمہ "The Great Wahabi Case" دائر کیا تھا۔[۲۴] دونوں تحریکوں کا بنیادی مقصد تقریباً یکساں تھا، جب کہ فروعی مسائل میں چند اختلافات ضرور تھے۔ دونوں تحریکیں اجتہاد، اتباع سنت، تقلید سے دوری اور بدعات و خرافات کا قلعہ قمع کرنے پر زور دیتی تھیں۔[۲۵] ہو سکتا ہے کہ دونوں تحریکوں کے مابین کافی مماثلت پائے جانے کی وجہ سے عام لوگ زیادہ فرق نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیتومیر، حاجی شریعت اللہ اور سید احمد شہید کی تحریکوں کی جائے پیدائش ایک ہونے کی وجہ سے تھا۔[۲۶]

انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں متحدہ بنگال کے اندر قائم ہونے والی تحریکوں میں حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک (۱۸۱۸ء) اور تیتومیر کی طریقۂ محمدیہ کا مذہبی و اصلاحی پہلو انہیں اصول پر قائم تھا۔[۲۷] سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کی تحریک حاجی شریعت اللہ اور سید احمد شہید کی تحریکوں پر مقدم ہے،[۲۸] جب کہ طریقۂ محمدیہ کا سیاسی پہلو سید احمد کے سیاسی نظریہ سے مختلف ہے۔ ایک موقف یہ بھی ہے کہ تیتومیر کی ملاقات سید احمد شہید کی ۱۸۲۰ء اور ۱۸۲۲ء کے کلکتہ دورہ سے ثابت نہیں ہے اور نہ ہی بعد میں کبھی ان سے ملے تھے۔[۲۹] جب کہ ہنٹر کا کہنا ہے جب سید احمد ۱۸۲۲ء میں مکہ گئے تھے، اس دوران تیتومیر بھی مکہ میں تھے۔ لہٰذا مکہ میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی

---

[۲۳] Khan, Moin-Ud-Din Ahmad, *History of Faraidi Movement*, Islamic Foundation, Bangladesh ,1984 p. 64

[۲۴] *The Great Wahabi Case*, R. Cambray&co.

[۲۵] Khan, Moin-Ud-Din Ahmad, *Socio-religious Conditions of Muslims in nineteenth century Bengal*, pp. 45-46.

[۲۶] Ali, Muhammad Mohar, *History of the Muslims of Bengal*, Imam Muhammad ibn Saud Islamic University, Riyad, 1988, V; IIB, pp. 241-242,

[۲۷] Khan, Moin-Ud-Din Ahmad, *Socio-religious Conditions of Muslims in nineteenth century Bengal*, pp. 46-53.

[۲۸] Ali, Muhammad Mohar, *History of the Muslims of Bengal*, pp.243.

[۲۹] Khan, Moin-Ud-Din Ahmad, *Socio-religious Conditions of Muslims in nineteenth century Bengal*, pp. 46-53.

تھی۔ وہیں سے تیتو میر، سید احمد سے متاثر بھی ہوئے تھے۔[۳۰] بہاری لال سرکار نے لکھا ہے کہ سید احمد شہید نے پبنا ضلع (موجودہ بنگلہ دیش) کے ایک عالم مولوی محمد حسین کو اپنا خلیفہ منتخب کیا تھا۔ بعد میں تیتو میر نے ان سے خلافت حاصل کی تھی۔ خلافت کے دو اہم ذمہ داریاں تھیں:

(الف) صفات خداوندی کو انسانی صفات سے بالکل مشابہ قرار نہ دیا جائے۔ نیز پیر، مرشد، نبی اور رسول وغیرہ کی عبادت سے پرہیز کیا جائے۔

(ب) قرآن وسنت سے غیر ثابت رسم و رواج سے دوری اختیار کی جائے۔

تیتو میر نے اپنے ساتھیوں کو ان ہدایات پر عمل کرنے کی خصوصی تاکید کی۔[۳۱] اسی طرح انھوں نے شادی بیاہ اور موت پر جلسہ وجلوس کرنے، نعش کو سجانے، قبر کو پختہ کرنے اور تعزیہ بنانے سے روکا۔[۳۲] اپنے پیروؤں کو داڑھی بڑھانے اور دھوتی کو دونوں پیروں کے بیچ سے اس کے ایک حصہ کو گھما کر پہننے سے منع کیا بلکہ اسے تہمد کی طرح پہننے کیلئے کہا۔[۳۳] اس زمانے میں مسلمان ہندو نام رکھ لیا کرتے تھے، انھوں نے مسلمانوں کو عربی واسلامی نام رکھنے کی تلقین کی۔[۳۴] سود لینے اور دینے دونوں سے منع کیا۔[۳۵] انھوں نے ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کے خلاف بھی آواز بلند کی۔

تیتو میر نے اپنے شاگردوں کو اخلاقی ذمہ داری، سماجی مساوات، اقتصادی ہم آہنگی اور سیاسی آزادی کی تعلیم دینا شروع کیا تو عوام الناس کی ایک کثیر تعداد ان کی جانب متوجہ ہوئی۔[۳۶] انہوں نے اپنے پیروؤں کو زیادہ سے زیادہ مساجد و مکاتب کی تعمیر پر ابھارا تا کہ تمام مسلمان مسجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کر سکیں۔ اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ خود دین کے پانچوں ارکان کی تعمیل کریں اور عوام الناس کو بھی اس کی تاکید کریں نیز ان پر اس کی اہمیتوں اور ضرورتوں کو واضح کریں تا کہ مسلمان اسلام کا عملی مجسمہ بن

---

[۳۰] *History of Faraidi Movement*, pp. 65-67.

[۳۱] ماخذ سابق، تیتو میر بانر کلبڑیار لڑائی ص: ۱۹

[۳۲] ماخذ سابق، ص: ۲۰

[۳۳] *The History of Faraidi Movement*, p. 71.

[۳۴] ماخذ سابق، نبو روپے تیتو میر، ص: ۵۷

[۳۵] ماخذ سابق، تیتو میر بانر کلبڑیار لڑائی، ص: ۱۶

[۳۶] *The Muslim Heritage of Bengal*, p. 93.

سکیں۔[۳۷] انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جو ان باتوں پر عمل کرے صرف اسی کی صحبت اختیار کریں۔ جن کی شخصیت داغ دار ہے اس سے کنارہ کشی اختیار کریں، ان کے یہاں مہمان تک نہ بنے۔ اس طرح تیتومیر نے ایک علیحدہ سماجی گروہ بنانے کی کوشش کی جس کا دائرہ کولون کے رپورٹ[۳۸] کے مطابق تین اضلاع: ۲۴ پرگنہ، نادیہ اور جیسور کے ۲۰ بڑے ۱۴ میل کے وسیع خطے پر مشتمل تھا[۳۹] اور یہ محض تین سال کے جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

فرائضی تحریک اور تیتومیر کی تحریک کے درمیان بہت یکسانیت تھی سوائے چند چیزوں کے، جیسے ان میں ایک فرق یہ تھا کہ طریقۂ محمدیہ کے پیروکار نماز جمعہ ادا کرتے تھے، گویا وہ ہندوستان کو دارالاسلام یا دارالامن مانتے تھے، جب کہ فرائضی تحریک کے متبعین ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے، جس کی بنا پر وہ نماز جمعہ ادا نہیں کرتے تھے۔[۴۰]

تیتومیر کی تحریک سے لوگ بہت تیزی سے جڑتے گئے۔ ان میں سب سے پہلا شخص جس نے ان کی پیروی اختیار کی وہ جیسور کے فیض الدین تھے جو ۱۸۲۷ء میں تیتومیر کے کلکتہ پہنچتے ہی ان کی دینی واصلاحی جذبہ سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔[۴۱] تیتومیر کی تحریک تیزی سے بڑھی حتی کے ابتدائی چند ہی دنوں میں ان کے شاگردوں کی تعداد تین سے چار سو تک پہنچ گئی تھی۔[۴۲] ان کا یہ دعوتی مشن ۲۴ پرگنہ سے نکل کر نادیہ، جیسور اور کلکتہ وغیرہ تک کے علاقوں میں پھیل گیا تھا۔[۴۳]

سیاسی جدوجہد اور تحریک کسان

۱۷۰۷ء میں مغل شہنشاہ اورنگزیب کے انتقال کے بعد مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں زوال آیا۔ برطانوی

---

[۳۷] Ibid, p. 93.

[۳۸] تیتومیر سے متعلق *W.S. Alexander* اور *J. R. Colvin* کی سرکاری رپورٹس ۲۵ نومبر ۱۸۳۱، ۸ مارچ ۱۸۳۲ اور ۱۳ اپریل ۱۸۳۲ بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (*History of the Muslims of Bengal*, p.243 کے حاشیہ میں درج ہے)

[۳۹] Ali, Muhammad Mohar, *History of the Muslims of Bengal*, p. 253-254.

[۴۰] *History of Faraidi Movement*, pp. 72-74.

[۴۱] *The Muslim Heritage of Bengal*, p. 93.

[۴۲] Ibid, p. 93.

[۴۳] Ibid.

ایسٹ انڈیا کمپنی جس کا مقصد صرف تجارت کرنا تھا، اب ہندوستان میں حکومت کرنے کا خواب دیکھنے لگی تھی۔ اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا آغاز اس نے پلاسی کے میدان میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو ۱۷۵۷ء میں شکست دے کر کیا۔ کمپنی نے بنگال کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی طاقت کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ نیز ۱۷۶۰ء تک ۲۴ پرگنہ، بردھوان، مدنی پور اور چٹاگانگ پر مکمل اقتدار حاصل کرکے بنگال کی دولت کو کشتیوں میں بھر بھر کے برطانیہ روانہ کرنے لگی، اور بنگال کو ۱۷۶۹ء۔ ۱۷۷۰ء کی قحط سالی و بھک مری میں مبتلا کر دیا۔ اس قحط میں عوام الناس کی ایک بہت بڑی تعداد موت کے شکار ہو گئی۔[۴۴]

۱۷۵۷ء سے قبل ہندوستان کی سرزمین پر دو طرح کے لوگوں کی حکومت تھی۔ ایک خود یہاں کے باشندے یا پھر باہر سے آئے ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اس سرزمین کو مستقل جائے سکونت بنا لیا تھا۔ مگر پہلی بار یہاں انگریزوں نے حکومت کی جن کا مقصد کبھی بھی ہندوستان میں قیام پذیر ہونے کا نہیں تھا، بلکہ عوام کو غلام کے طور پر استعمال کرکے تمام مال و دولت کو برطانیہ پہونچانا تھا۔[۴۵] برطانوی حکومت سے قبل زمین کے مالک خود کسان ہوتے تھے۔ فصل کا آسان ٹیکس بیسواں، دسواں اور پانچواں حصہ کے مع شرائط ذاتی و قدرتی سیرابی کے تحت متعین ہوتا تھا۔ کاشت کاروں کو اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق کھیتی کرنے کی پوری آزادی ہوتی تھی، مگر کمپنی نے ایکٹ ۱۷۹۳ء عائد کرکے کاشت کاروں سے ان کے زمین کا مالکانہ حق ختم کرکے بڑے بڑے زمینداروں کو اس کا مالک بنا دیا۔ ان زمینداروں نے کمپنی کے فائدہ کے مطابق کسانوں سے کھیتی کرانا شروع کیا اور کھیتی نہ کرنے پر ظلم و ستم کیا۔ یورپیوں نے دھان، گیہوں، جو وغیرہ کی جگہ صرف نیل کی کھیتی کرنے پر کسانوں کو مجبور کیا۔ طرح طرح کے آراضی ٹیکس اور قرض عائد کرکے ان کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ ان حالات میں اصلاح معاشرہ کے مبلغ تیتومیر کسانوں کے غمگسار اور ہمدرد بن کر کھڑے ہوئے۔[۴۶]

تیتومیر نے ہندو زمینداروں اور نیل کی کھیتی کرانے والے یورپیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، تو عوام ان کی طرف کھنچے چلے آئے۔ اس تحریک کے بڑھتے اثر و رسوخ کو دیکھ کر زمینداروں اور

---

[۴۴] *The Muslim Heritage of Bengal*, p. 93.

[۴۵] ماخذ سابق، سیف اللہ، تیتومیر، ص: ۶

[۴۶] *Shaheed Titumir The Muslim Hero of Bengal*, pp. 1-4.

یورپیوں نے تیتومیر اوران کی تحریک میں نقص تلاش کرنا شروع کیا تاکہ اسے بدنام کرکے دبایا جاسکے۔ زمینداروں کے اس عمل میں وہ مسلمان بھی شامل تھے جو بدعات و خرافات کو اب بھی اسلام سمجھتے تھے۔[۴۷] ان سرکردہ ہندو زمینداروں میں تارہ گونیہ کے رام نرائن ناگ، نگرپور کے گورپرشاد چودھری اور پنڑہ کے کرشنادیورائے وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یورپیوں میں اسٹروم اوراینڈروز وغیرہ تھے۔[۴۸]

تیتومیر اوران کے ساتھیوں کوڈرانے دھمکانے میں کرشنادیورائے پیش پیش تھا۔ اس نے اپنے علاقہ میں مساجد و مکاتب کی تعمیر سے مسلمانوں کوروکا نیز داڑھی رکھنے پر ڈھائی روپیہ سالانہ ٹیکس عائد کیا۔[۴۹] اس نے سرپوراجپور[۵۰] (Safarazpur) گاؤں میں اپنے تین سے چار سو لوگوں کے ساتھ تیتو میر کے ساتھیوں کوزخمی کرکے لوٹ مار کی، مسجد توڑی اور قیمتی چیزوں پر قبضہ کرلیا۔ فریقین نے اس معاملہ کو بدوڑیہ تھانہ میں درج کرایا۔ زمیندار کی طرف سے لکھایا گیا کہ ''تیتو میر کی جماعت نے ہمارے لوگوں کو قید کرر کھا تھا اس لئے ہم انہیں چھڑانے گئے تھے'' جبکہ تیتومیر کے ساتھیوں نے درج کرایا کہ ''زمیندار کے لوگوں نے جان بوجھ کر لوٹ مار کی ہے اور قصداً مسجد توڑی ہے''۔ جب معاملہ بارہ سات کے جوائنٹ مجسٹریٹ کے پاس پہنچا، تو فرار زمیندار نے بسیر ہٹا کے داروغہ رام رام چکرورتی کے ساتھ پہنچ کر بیان دیا کہ ''میں دنگافساد کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں اور ہنگامہ کے وقت میں کلکتہ میں تھا''۔ مجسٹریٹ نے داروغہ کی درخواست پر مسئلہ کو سلجھانے کی ذمہ داری انہیں ہی دے دی۔ داروغہ نے یہ کہہ کر مسئلہ کورفع دفع کردیا کہ ''زمیندار کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ تیتومیر کے لوگوں نے خود مسجد جلائی ہے''۔ عدالت نے اسی کو بنیاد بنا کر فیصلہ سنادیا۔[۵۱] بہاری لال نے لکھا ہے: ''تیتو میر کو زمینداروں نے طرح طرح کی پریشانیوں میں ڈال دیا تھا۔ ٹیکس نہ دینے پر مسلمانوں کو قید کرلیا

---

[۴۷] *The Muslim Heritage of Bengal*, p. 93.

[۴۸] ماخذ سابق، سیف اللہ، تیتومیر، ص:۱۸۔

[۴۹] *History of Faraidi Movement*, p. 71.

[۵۰] سرفرازپور، حیدرپور سے ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں پہلے سے ہی ایک مسجد تھی جسے بنگال پر مراٹھوں نے حملے کے دوران توڑ دیا تھا۔ اسی کے نزدیک تیتومیر نے ایک نئی مسجد تعمیر کرایا تھا۔ وہ مسجد اس علاقہ میں تیتومیر کے تحریک کی مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ (*History of the Muslims of Bengal*, p. 253.)

[۵۱] *The Muslim Heritage of Bengal*, pp. 93-94.

جاتا تھا۔ جھوٹے مقدموں میں پھنسا دیا جاتا تھا، لہذا مسلمان جوائنٹ مجسٹریٹ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے کلکتہ گئے، مگر اس دن جج نہیں تھے، چنانچہ وہ لوگ ناامید ہو کر واپس چلے آئے''۔[۵۲]

حجاز کی وہابی تحریک کا بنیادی مقصد اصلاح امت اور تجدید اسلام تھا لیکن ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں اس مقصد کے علاوہ اس تحریک کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کو تقویت پہنچائی جائے، ساتھ ہی یہ تحریک بنگال میں مسلمان کسانوں اور ہندو زمینداروں کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوئی۔[۵۳]

تیتومیر ایک اچھے اور ایماندار مسلمان تھے۔ انہوں نے دعوت اسلام کے خاطر خود کو وقف کر رکھا تھا، لیکن انہوں نے زمینداروں کی ستم ظریفی اور اور جھوٹے مقدموں سے پریشان ہو کر ہتھیار کا سہارا لیا۔[۵۴] ۲۳ اکتوبر ۱۸۳۱ء میں نرکلبیڑیا (موجودہ ۲۴ پرگنہ) کو اس تحریک نے اپنا مرکز بنایا۔[۵۵] اور ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۱ء اور ۱۵ نومبر ۱۸۳۱ء کی لڑائی کے علاوہ دیگر چھوٹی بڑی جھڑپوں میں زمینداروں کو زیر کیا۔ نادیہ ضلع کے مغربی نیل کی کھیتی کرانے والوں پر حملہ کیا اور ان کے پاس کسانوں کے قرضوں کی جتنے کاغذات تھے سب کو جلا دیا۔[۵۶] تیتومیر نے زمینداروں کے علاوہ دو دفعہ انگریزوں کو بھی شکست دی۔ انہوں نے انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت کا غاصب اور دشمن گردانتے ہوئے خود کو آزاد ہندوستان کا راجا ہونے کا اعلان کیا۔ وہ آس پاس کے زمینداروں سے ٹیکس وصول کرنے لگے اور بلا اطلاع لڑائیوں سے بچنے کے لئے ۳۰ ایکڑ پر پھیلی زمین پر بانس کا قلعہ تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ اپنی صنعت میں ثانی نہیں رکھتا۔[۵۷] انھوں نے معزالدین کو وزیر اور میر معصوم خان کو سپہ سالار مقرر کیا۔[۵۸] تیتومیر کے اہم معاونین میں فقیر نیتا مجنوں شاہ کے فوج میں شامل مسکین شاہ نام کے ایک شخص تھے، جو ہمیشہ تیتومیر کے ساتھیوں

---

[۵۲] تیتومیر بانر کلبیڑیار لڑائی ص: ۲۱۔۲۳

[۵۳] Sarkar, Jagadish Narayan, *Islam in Bengal,* Ratna Prakashan, Calcutta, 1972, p. 62.

[۵۴] تیتومیر بانر کلبیڑیار لڑائی، ص: ۲۷

[۵۵] ماخذ سابق، سیف اللہ تیتومیر ص: ۱۹

[۵۶] *The Indian Musalmans*, p. 46.

[۵۷] ماخذ سابق، سیف اللہ، تیتومیر، ص: ۲۱۔

[۵۸] دیوی، مہاشویتا، تیتومیر (بنگلہ)، سب کال پرکاشنی، کلکتہ، ۱۹۵۴ء، ص: ۴۶

کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔[۵۹] ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔[۶۰] جیسور کے منیر الدین شاہ فقیر کی طرح ۲۴ پرگنہ اور نادیہ کے علاوہ دیگر علاقوں سے بھی کافی فقیر مجاہدوں نے حصہ لیا تھا۔[۶۱]

تیتومیر کے بڑھتے رسوخ کو ختم کرنے کے لئے کلکتہ ضلع محکمہ نے ۱۴ نومبر ۱۸۳۱ء میں نرکلبڑیا کی جانب فوج روانہ کی۔ ہنٹر نے انگریزی فوجی کارروائی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے کہ فوجی کمانڈر نے بغیر کارتوس کے فائرنگ کرنے کے لئے کہا تا کہ تیتو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرینڈر کردیں، مگر تیتو میر نے برطانوی فوج پر حملہ کیا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔[۶۲] جبکہ پوری جنگ میں انگریز فوج کے ایک سپہ سالار اور دو گھوڑے مارے گئے تھے۔[۶۳] اسی طرح تیتومیر پر الزام ہے کہ انہوں نے بہت سے مندروں کو توڑا۔ اس کے جواب میں سبھو جیت بگچی نے پروفیسر گوتم بھدرا کے حوالے سے کہا ہے کہ:

> ۱۷ نومبر ۱۸۳۱ء کو برطانوی فوج نے جس میں اب زمینداروں کے لوگ بھی شامل تھے، قلعہ پر زوردار حملہ کیا۔ اس جنگ میں تیتومیر کو شکست ہوئی اور وہ مع ۵۰۔۶۰ مسلمان بھی شہید کردیے گئے۔[۶۴] ان شہدا کو کرنل الیگزنڈر نے اکٹھا کر کے جلادیا تا کہ ان کے قبروں کو مرکز بنا کر دوبارہ کوئی سر نہ اٹھا سکے۔[۶۵] ۳۵۰ لوگوں کو موقعے پر قید کرلیا گیا تھا۔[۶۶] فرار اختیار کرنے والوں میں ۱۱۰ افراد کو پکڑنے یا سراغ بتانے پر ۵۰۔۶۰ روپیہ کا انعام رکھا گیا تھا۔ مقید افراد کو مختلف سزائیں سنائی گئیں۔ اس طرح کل ۱۹۷۱۳ ہندوؤں اور مسلمانوں پر مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔[۶۷] اس جنگ میں ہندو بھی شامل تھے۔[۶۸] ان کے ہار کی سب سے بڑی وجہ ان کے پاس جدید اسلحہ کا نہ ہونا تھا۔[۶۹] عدالت نے میر معصوم کو

---

[۵۹] ماخذ سابق، ص: ۴۶

[۶۰] Qeyamuddin Ahmad, *The Wahabi Movement in India*, Firma K. L. Mukhopadhyay, Calcutta, 1966, p. 90.

[۶۱] Muhammad Mohar Ali, *History of the Muslims of Bengal*, 1988, V;IIB, p. 254.

[۶۲] *The Indian Musalmans*, p. 46.

[۶۳] *The Govt Gazette*, 21.11.1831

[۶۴] ماخذ سابق، سیف اللہ، تیتومیر، ص: ۲۳۔

[۶۵] ماخذ سابق، ص: ۲۵۔

[۶۶] *The Muslim Heritage of Bengal*, p. 91.

[۶۷] ماخذ سابق، تیتومیر بانر کلبڑیار لڑائی، ص: ۱۰۵۔

[۶۸] ماخذ سابق، ص: ۱۶۔

[۶۹] ماخذ سابق، ص: ۲۳۔

پھانسی کی سزا سنائی اور بھرے بازار میں پھانسی دی تاکہ کوئی بھی انگریزوں کے خلاف سر نہ اٹھاسکے۔[۷۰] تیتومیر کی شہادت بنگالی کسانوں کے احتجاج کاایک اہم شخصی علامت بن گئی۔[۷۱]

ولیم ہنٹر ۱۸۳۱ء میں سید احمد کی بالا کوٹ میں شہادت اور نرکلبیڑیامیں تیتو میر کی شہادت کو اصلاحی تحریکات کے خاتمہ کے طور پر درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پنجاب میں اصلاح پسندوں کے خاتمے سے ان کی فوجیں بکھر گئیں اور ان کے لیڈر مارے گئے۔ بنگال کے نشیبی علاقے میں ہونے والی بغاوت کا بھی یہی انجام ہوا۔[۷۲]

کسانوں کا مسئلہ حل نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں نے فرائضی تحریک کو اپنا مسیحا سمجھا اور اب اس سے منسلک ہونے لگے۔ لہذا ۱۸۳۱ء ہی سے اس تحریک نے کسانوں کی بھی آواز بلند کرنا شروع کی اور علمائے صادق پور سید احمد شہید کے وارث بن کر ابھرے۔[۷۳]

خلاصہ کلام

تیتو میر ایک مصلح، خیر خواہ اور ہمدرد قوم وملت تھے۔ انھوں نے ذات برادری، توہم پرستی اور بدعات و خرافات کو چھوڑ کر خالص فطرت اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی تبلیغ کی۔ آہستہ آہستہ ان کی اصلاحی کوششوں نے طول پکڑا اور وہ وقت کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے عوام الناس، خصوصاً کسانوں کے لئے، زمینداروں، یورپین نیل کے کھیتی کرانے والوں اور کمپنی حکومت کی ظلم و ستم کے خلاف نجات دہندہ کے طور پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تیتومیر نے کبھی جنگ کو حل تصور نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی اور جب انصاف نہیں ملا تو خود انصاف دہندہ بن گئے۔ تیتومیر ہندوستانی سطح پر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں اور ظلم وجور کے خلاف اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرنے والوں کی صف اول میں شامل ہیں۔

---

[۷۰] ماخذ سابق، ص: ۲۵۔

[۷۱] *The Muslim Heritage of Bengal*, p. 91.

[۷۲] *The Indian Musalmans*, p. 47

[۷۳] *The History of Faraidi Movement*, p. 77.

اخبار علمیہ

تلنگانہ میں پائی جانے والی چٹانیں زمین کی ابتدا کے راز کھول سکتی ہیں

حیدر آباد کے شمال میں ۱۰۰ کلو میٹر کے فاصلہ پر تلنگانہ چتریل میں ۴.۱ بلین سال قدیم پتھروں اور موسم سے متعلق معدنی زر قون (ایک معدن جس کے بعض اقسام کو تراوش کر کے قیمتی پتھر بنائے جاتے ہیں)کا سراغ ملا ہے جو اس دور کے ارضیاتی واقعات پر روشنی ڈال سکتے ہیں، جب زمین اپنے بچپن میں تھی۔ پریزیڈنسی یونیورسٹی، ہیروشیما یونیورسٹی اور نیشنل سینٹر فار ارتھ سائنس اسٹڈیز (این سی ایس ایس) کے محققین کی تازہ ترین دریافت زمین کی ابتدائی کیمیائی شناخت کے بارے میں تازہ اشارے پیش کرتی اور نصف ارب سال پرانے اس سیارے کے رازہائے سربستہ سے پردے اٹھا سکتی ہے۔اس دریافت کے نتائجِ تحقیق حال ہی میں پری کیمبرین ریسرچ جرنل میں شائع ہوئے ہیں۔اس مطالعہ کا حصہ رہنے والے ماہرین ارضیات میں سے ایک نے کہا کہ تلنگانہ میں ہیڈن زر قون کی دریافت یہ اشارہ کرتی ہے کہ زمین کی ابتدائی تاریخ ان موجود چٹانوں میں چھپی ہوئی ہے، یہ اہم بات ہے۔اس تحقیقی ٹیم کے سربراہ پروفیسر سنکر بوس کہتے ہیں کہ مزید مطالعہ ہمیں پانی کی موجودگی سمیت زمین کے پہلے چند سو ملین سال کی کیمیائی اور جسمانی حالت کو سمجھنے میں مدد کرے گا۔اس سے زیادہ پرانی دریافت ۲۰۱۸ میں اڈیشہ کے کینڈوجھار ضلع کی ٹونالیٹک چٹانوں میں ہوئی تھی۔اس دریافت کا تخمینہ ۴.۲ بلین سال سے زیادہ پرانا تھا۔یہ زر قون ۴ بلین سال سے کچھ زیادہ پرانا ہے۔اس سے قبل کیرالہ کے وایناڈ میں ۲۰۱۶ میں اور اڈیشہ کے دریا بیترنی سے ۲۰۱۸ میں زر قون پایا گیا تھا۔زمین کا سب سے قدیم زر قون (تقریباً ۴.۴ بلین سال قبل) مغربی آسٹریلیا کے جیک ہل میں پایا گیا تھا۔ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ اس دور کی بہت سی معدنیات اور چٹانیں فنا ہو چکی ہیں لیکن زر قون اپنی انتہائی جسمانی اور کیمیائی لچک کی وجہ سے وقت کے امتحان سے بچ گیا ہے۔اس لیے اس معدنیات کو زمین کی تاریخ کا سب سے زیادہ معتبر ٹائم کیپر کہا جاتا ہے۔پریزیڈنسی جیولوجی کے پروفیسر گھوش جنھوں نے اسنیہا مکھرجی اور پریتاداس کے ساتھ مل کر مطالعہ کیا ہے کہا کہ ابتدائی تجزیہ ہیروشیما یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر کوشک داس نے کیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں آلات سازی کی سہولت کے ہونے سے کافی مدد ملی۔گھوش نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ توسیعی مشین کے اوقات کا استعمال کرتے ہوئے تجزیہ کی ضرورت ہے۔(ٹائمز آف انڈیا، ۲۷ فروری ۲۰۲۳ء ص ۱۰) ک، ص اصلاحی

تبصرۂ کتب

فلسفۂ تعلیمات از ڈاکٹر محمد نعمان خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۳۴، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: ایف-۳، گویل ہری اپارٹمنٹ، پی این بی کالونی، عیدگاہ ہلز، بھوپال، ایم- پی ۴۶۲۰۰۱، سن اشاعت ۲۰۲۱ء، فون نمبر: ۴۵۶۸۸۲۰۴، ای میل: info@ephbooks.com

کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں فن تعلیم و تدریس ہی پر بحث ہوگی اور مضامین کے ایک بڑے حصہ سے اس خیال کی تائید بھی ہوتی ہے، جیسے شروع ہی میں فلسفہ نظام تعلیم کے عنوان سے ایک مضمون ہے لیکن اس کے ساتھ ایک "مسلسل سفر بے منزل" کے الفاظ چونکاتے ہیں، مگر مضمون کا خاتمہ صاف کر دیتا ہے کہ نظام تعلیم کے سفر کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی نظریات اور مصلحت اندیشی سے ہر طرح اس نظام کو پاک صاف رکھا جائے۔ تدریسی مقاصد کے ساتھ زبان کی تدریس، اس کے نفسیاتی عوامل، شمولیاتی نظام تعلیم، تدریس و آموزش میں کثیر لسانیت کی اہمیت، تدریس زبان کی مبادیات جیسے عنوانوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے موضوع پر اس کتاب کی کیا اہمیت ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ کتاب کا بڑا حصہ اردو اور اس کی تعلیم و تدریس کے لیے وقف ہے۔ ہندوستان میں اردو کے وسائل و مسائل، علاقائی زبانوں کی موجودگی کا اردو پر اثر، اسکولی سطح پر اردو کی تدریس، این سی آر ٹی اور اردو، روزگار کے مواقع، ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم، فاصلاتی نظام تعلیم میں اردو، ایسے موضوعات پر بہت کم رہنمایانہ معلومات ہیں، لیکن فاضل مؤلف کی پوری زندگی گیسوئے اردو کہیے یا اس کی زلف تدریس، ان ہی کو سنوارنے میں گزری، سیفیہ کالج کی اردو کی معلمی ہو یا نئی دہلی میں این سی آر ٹی سے طویل وابستگی ہو وہ عملاً اردو تدریس و تعلیم کے مسائل اور حل ہی میں مشغول رہے۔ درسی کتابوں کو تیار کیا، تربیتی پروگراموں میں اپنے تجربات کی دولت عام کرتے رہے، جواہر نوودے ودیالیہ ہو، اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی ہو، سی ای آئی ٹی کے ریڈیو ٹی وی پروگرام ہوں، وہ بولتے اور لکھتے رہے، زیر نظر کتاب میں اسی سلسلے کی اہم نگارشات کو جمع کر دیا گیا، پروفیسر عتیق اللہ نے بالکل صحیح لکھا کہ مصنف نے ہر تجزیے میں دیانت داری کو رہنما اصول کے طور پر پیش نظر رکھا، پھر ان میں فکر ہے اور مواد کی جامعیت بھی ہے۔

بحیثیت مضامین کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں تعلیم، تدریس اور پھر اردو کے حوالہ سے گفتگو ہے، دوسرے حصہ میں اردو کے بعض ممتاز ترین ماہرین تعلیم کے تعلیمی افکار

و نظریات کا مطالعہ ہے، سر سید، مولانا آزاد، نواب سلطان جہاں بیگم، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ملا فخر الدین، پروفیسر حنیف نقوی جیسے مشاہیر کے افکار کو بڑی خوبی سے جمع کیا گیا، منشی محمد حسین آزاد کو ماہر درسیات سمجھنے کی شاید کم کو توفیق ہوئی ہوگی۔ اسی طرح مولانا اسماعیل میرٹھی کو شاعر نصاب کی حیثیت سے دیکھا جانا بھی فاضل مصنف کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔ گاندھی، ٹیگور اور وویکانند کے تعلیمی نظریات سے بھی موضوع کی ہمہ گیری میں اضافہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہند کی موجودہ قومی تعلیمی پالیسی کے حسن و قبح پر تجزیاتی رائے رکھنے والوں کی اردو میں بڑی کمی ہے۔ اب شمولیاتی نظام سے ہمارے ارباب تدریس میں کتنے ہیں جو پوری واقفیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں، جدید تعلیم کا ایسا تصور جس کا بنیادی نقطہ طفل مرکز تعلیم ہے، مصنف کے نزدیک یہ نہایت اہم اور کارگر طریقہ تدریس ہے۔ اس قسم کے موضوعات سے واقفیت کے لیے تعلیم و تدریس اور خصوصاً اردو کے نظام تدریس سے وابستہ ذمہ داروں کے سامنے اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ مصنف نے ایک جگہ لکھا کہ ان کا آبائی پیشہ ہی معلمی اور طبابت ہے۔ معلمی تو ظاہر ہے لیکن اس کتاب سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اردو کے مروجہ نظام تعلیم کی بہت سی بیماریوں کا علاج جس طرح بتایا گیا، وہ واقعی طبابت کے ان کے آبائی پیشے کی تصدیق ہے۔ ایسی ضروری، مفید اور کارآمد کتاب کے لیے فاضل مصنف لائق تحسین ہیں۔

علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو از: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، غیر مجلد گرد پوش خوبصورت، صفحات ۲۳۲، قیمت ۱۴۰ روپے، ناشر کا پتہ: ویسٹ بنگال اردو اکیڈمی ۲، ۵۷ اے، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا، ۷۰۰۰۱۶ سن اشاعت ۲۰۲۱ء موبائل نمبر: ۹۰۵۱۷۲۸۳۹۵ اور ۸۵۸۴۰۶۹۰۷۴

علامہ شبلی کی بتیس سالہ عملی زندگی جن شعلہ نفسیوں سے گرم رہی اس کی کیفیت و کمیت کا شمار گویا ناممکن ہے، اسی میں انجمن ترقی اردو کے قیام و استحکام میں علامہ کی مساعی بھی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی میں ہر گوشہ پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ علامہ کی زندگی کا کوئی گوشہ رہ نہ جائے۔ دیکھا جائے تو یہ سمندر کی وسعتوں کو کوزہ میں سمانے کا عمل ہے، اسی میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے تعلق سے حیات شبلی میں قریب آٹھ دس صفحات ہیں جو شاید علامہ شبلی کے شیدائیوں کو دعوت دیتے رہے کہ اجمال کو اطناب اور اختصار کو تفصیل میں لانے کا فریضہ کوئی تو ادا کرے۔ خوشی ہے کہ دارالمصنفین کے رفیق اعزازی کو یہ توفیق ملی، شبلیات کے ان گوشوں تک ان کی رسائی ہوئی جن کی

جانب شاید ہی کسی کی نظر جاتی، یہ کتاب بھی ایسی ہی کوشش ہے جس میں علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو کے رشتوں کو جو گرچہ کم مدت تک استوار رہے۔ تاہم ان کو بڑی دقت نظر سے پیش کر دیا گیا۔ فاضل مولف نے پہلے تو یہ شکوہ کیا کہ انجمن ترقی اردو کے لیے علامہ شبلی کی جدوجہد کا ذکر و اعتراف جیسا ہونا تھا، نہیں کیا گیا بلکہ بقول مولف ستم یہ بھی کیا گیا کہ اعتراف تو دور ان کی کاوشوں کو کم کر کے دکھایا گیا بلکہ کہیں کہیں تو اعتراضات بھی کئے گئے۔ ان اعتراضوں کے جواب کے ساتھ بتایا گیا کہ بعد میں انجمن ترقی اردو کی فلک نما عمارت کی بنیاد میں علامہ شبلی نے کن مسالوں کا استعمال کیا۔ دستور العمل بنانا ہو، مقاصد کی وضاحت کرنا ہو۔ انجمن کے دائرہ کو وسعت دینا ہو۔ انجمن کے ارکان کے مختلف درجات کا تعین ہو، کتابوں کی تصنیف یا تراجم کا انتخاب ہو، اردو کے نصاب تعلیم کی فکر ہو، انجمن کی مطبوعات کے مستقل خریداروں کا نظام ہو ان سب پر تحقیق و جستجو نے کتاب کو اپنے موضوع پر انفرادی شان عطا کر دی۔ ایک باب داستان انجمن کے عنوان سے ہے اور کمال یہ ہے کہ یہ داستان خود علامہ کی زبان سے سنائی گئی۔ اس میں انجمن کی وہ اولین روداد یں شامل ہیں جن سے اچھے اچھے ناواقف تھے۔ یہاں تک کہ علامہ شبلی نے انجمن کے تعلق سے جو اشتہار دیے وہ بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ فاضل صاحب کتاب اب صاحب کتب کثیرہ ہیں، انہوں نے کتابوں کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ اب بھی قریب اٹھارہ کتابیں ہیں جو منتظر تعارف و تبصرہ ہیں۔ سب کے بارے میں کچھ نہیں تو بس یہی جملہ کافی ہے کہ آج اگر شبلی زندہ ہوتے تو شاید ان کو بھی اپنے کارناموں پر توجہ دینے کی ان کاوشوں پر حیرت ہوتی۔ (ع۔ ص)

وہ یاد آئے بہت: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مرتب اسامہ رشادی، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۸۴، ملنے کا پتہ: مکتبہ الفہیم ریحان مارکیٹ دھوبیا املی روڈ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن۔ قیمت: ۴۲۵ روپے۔ سن طباعت ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر وای میل درج نہیں۔

سابق رفیق دار المصنفین ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے خصوصی تربیت یافتہ، اہم کتابوں کے مصنف اور ماہنامہ الرشاد کے مدیر ہیں۔ الرشاد میں مطبوعہ ان کے وفیاتی مضامین کا یہ دلکش مجموعہ اس لحاظ سے اہم اور لائق مطالعہ ہے کہ مرحومین سے صاحب کتاب کے علمی، تعلیمی، خاندانی اور ذاتی نوعیت کے تعلقات رہے ہیں۔ تعلقات کے اس پردہ پر انہوں نے گویا اپنے ماضی کی علمی وادبی سرگرمیوں کا ایک خوبصورت منظر پیش کیا ہے جس سے نہ صرف قاری کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں بلکہ اس کی فکری وادبی صلاحیت کو جلا و حوصلہ بھی ملتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا فضل الرحمن کیرانوی، مولانا محمد عمران خان ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا ضیاء الدین اصلاحی وغیرہ جیسے اکابر وفضلاء کا تذکرہ بڑے دلنشین اور ادبی پیرایۂ بیان میں لکھا ہے۔ پیش لفظ میں لکھا گیا ہے۔ ''آج ہم اسی جیسے ذخیرۂ سیرت وسوانح کے ایک بیش قیمت نمونے کو آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں جو ایک کہنہ مشق ادیب اور بے مثال صاحب قلم کے سوانحی ادب کی قابل رشک مثال ہے۔'' (ص۸) ان کی تحریر کی اصل خوبی علمی وادبی متانت سے عبارت ہے اور ان کے علمی و تحقیقی طرز تحریر پر دبستان شبلی کا واضح اثر موجود ہے۔ مگر دارالمصنفین سے علاحدگی کے بعد شخصیات کی سراپا نگاری میں ان کا اسلوب منفرد اور الگ رنگ کا حامل نظر آتا ہے۔ ایک ہی جملہ میں عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں کے الفاظ کے برمحل استعمال کی مثالیں جو قاری پر گراں نہ ہوں بہت کم ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔ دارالمصنفین سے ابتدائی تعلق کے متعلق شاہ صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ ''پھر رخش عمر کی تیز گامی نے ہوش وخرد کی آنکھیں وا کیں تو دارالمصنفین کے گل وگلزار کیمپس میں متعدد اعجوبۂ عصر ارباب علم وتحقیق کی دید سے دل ودماغ روشن ہوئے۔'' (ص۱۰۱) البتہ مضامین کی ترتیب تاریخی اعتبار سے غیر منطقی معلوم ہوتی ہے۔ جن کی وفات پہلے ہوئی تھی ان کو مقدم رکھنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ مجموعہ میں کل ۲۱ اشخاص کا تذکرہ لکھا گیا ہے لیکن پیش لفظ میں ۲ جگہوں پر ۲۳ کی تعداد تحریر ہے۔ (ص۹) مرتب کے مطابق الرشاد میں یہ مضامین پہلے شائع ہو چکے ہیں، اس لیے ہر مضمون کے آخر میں الرشاد کے ماہ وسنۂ اشاعت کا اندراج بھی ہونا چاہئے تھا۔ تصحیح اغلاط کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ان معمولی فروگذاشتوں سے قطعِ نظر اس مجموعہ کی افادیت مسلم اور ارباب ادب کا اس سے استفادہ ضروری ہے۔ مرتب وناشر اس ادبی سوانحی تذکرہ کی اشاعت پر قابل مبارک باد ہیں۔

پریم چند اور ان کا فن: ڈاکٹر شباب الدین، کاغذو طباعت عمدہ مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۲۰۔ ملنے کا پتہ: ایجو کیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۸۸۹۰۳۶۷۹۹۔ ای میل: درج نہیں۔

پریم چند کی سیرت، شخصیت اور ان کے فنی کمالات اور ادبی خدمات پر اردو میں اب تک درجنوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس مجموعہ مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اب سے پون صدی قبل

تحریر کیے گئے چند باحوصلہ نوجوان اہل قلم کی یادگار ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اردو فارسی سوسائٹی قائم کی گئی تھی، جس کے صدر مسعود عالم نے طلبہ کی علمی و تخلیقی صلاحیت کو نئی بلندیوں سے آشنا کرنے کے لیے پریم چند پر مضمون نویسی مقابلہ کرایا تھا اور اس کے عناوین اس طرح متعین کیے تھے کہ پریم چند پر ایک جامع کتاب ہو جائے۔ اچھے خاصے مضامین موصول ہوئے۔ یہ کتاب ان ۱۶ منتخب اور معیاری مضامین کا مجموعہ ہے جو اس مقابلہ کے لیے تحریر کیے گئے تھے۔ اس کی اشاعت اب عمل میں آئی ہے۔

ابتدائی تین مضامین پریم چند کے سوانح اور ان کے نظریۂ زندگی کی وضاحت و تفصیل سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد کے پانچ مضامین میں پریم چند کی افسانہ نگاری اور دو میں ان کے فن پر ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد گئودان، غبن اور بازار حسن پر مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ ایک مضمون پریم چند کی زبان اور ہندوستانی زبان کا مسئلہ کے عنوان سے ہے اور آخری دو مضامین اردو ادب میں پریم چند کی اہمیت کے جائزہ پر مشتمل ہیں۔

ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں سوانح کے ساتھ ساتھ پریم چند کی ادبی زندگی کے خد وخال، فکری ارتقاء کا عکس اور ان کے فنی خصائص و امتیازات کا واضح نقشہ سامنے آ گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ مضامین طلبہ کے تحریر کردہ ہیں لیکن ان میں کہیں ناپختگی، طالب علمانہ رنگ اور پر اثر اسلوب کی کمی نظر نہیں آئی۔ مرتب جامع پیش لفظ اور اس خوبصورت پیشکش کے لیے اہل ادب کے شکریے اور ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔

مولانا محمد عزیر قاسمی معروفی نقوش زندگی اور منتخب مضامین: اسعد الاعظمی، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۹۲۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ قاسمیہ (تنظیم ابنائے قدیم دیوبند) ۱۱۶/۱۹، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل ۹۸۱۸۷۱۵۰۴۴۔ ای میل: درج نہیں۔

پورا معروف، ضلع مئو کا تاریخی اور مردم خیز قصبہ ہے۔ صاحب تذکرہ کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ مرحوم کے ذاتی احوال و کوائف سے متعلق ہے جو زیادہ تر ان کے افراد خاندان کے تحریر کردہ ہیں۔ اس میں ان کی ذہانت و فطانت، علمی لیاقت، قوت حافظہ، علم حدیث، منطق، فلسفہ اور عربی زبان و ادب میں ان کی مہارت کے ساتھ ساتھ اس بات کا تذکرہ پر زور انداز میں کیا گیا ہے کہ انہوں نے بخاری شریف کے بہت سے ابواب مع اسناد حفظ کیے تھے۔ (ص ۸) اس سے مولانا

کے علم حدیث سے خصوصی شغف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مرحوم نے اپنی طالب علمی کا زمانہ دارالعلوم کے خیر القرون میں گذارا تھا۔ (ص ۱۱) ان کے اساتذہ میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا اعزاز علیؒ وغیرہ کے نام ہیں۔ مولانا کے انتقال پر جو تعزیتی مجلسیں منعقد کی گئیں ان کی رپورٹوں اور تاثرات کو بھی اس حصہ میں شامل کیا گیا ہے۔ ص ۱۰۸ سے ۱۱۱ تک ایک خاکہ میں ان کی تدریسی مشغولیات، امتیازات اور علمی کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مولانا نے متبحر عالم ہونے کے باوجود کوئی علمی تصنیف نہیں کی تاہم بعض مضامین تحریر کیے تھے حصہ دوم میں استفادۂ عام کے لیے ان کو شامل کیا گیا ہے۔ ہمارے دور کا دارالعلوم دیوبند، محمد ابراہیم بلیاوی، محمد اعزاز علی امروہوی، شاہ وصی اللہ فتح پوری، محدث اعظمی، مولانا وحید الزماں کیرانوی، والدماجد اور محمد امانت اللہ پر ان کے ۸ مقالات شامل ہیں مؤخر الذکر دونوں مضمونوں کے علاوہ تمام مضامین ترجمان العلوم، دیوبند میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین سے مولانا کی علمی صلاحیت اور ان کے اسلوب تحریر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں کوثر معروفی، انصار معروفی، مطیع اللہ مسعود قاسمی اور مرتب کتاب کی منظوم وفیات ہیں۔

مولانا نسبتاً کم مشہور اہل علم تھے لیکن ان کی زندگی میں دوسروں کے لیے سبق ہے۔ مثلاً عفوو درگذر، تکریم ضیوف، نصف شب کے بعد مطالعہ اور حاصل مطالعہ بیان کرنے کے معمول کے متعلق متعدد واقعات مرتب نے لکھے ہیں۔ شامل مقالات میں زیادہ تر توازن واعتدال کے حامل ہیں۔ کہیں کہیں مبالغہ آرائی بھی در آئی ہے۔ **(ک۔ ص۔ اصلاحی)**

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی قرآن فہمی (بالخصوص بیان القرآن کے احکامات کی روشنی میں) مصنف: ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، خلیق احمد نظامی سینٹر علی گڑھ، قیمت ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۱ء، صفحات ۱۶۴

پرفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی جانب منسوب خلیق احمد نظامی سینٹر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ملحق ایک علمی ادارہ ہے۔ قرآنیات سے متعلق موضوعات پر اس کا دائرہ کافی رہا ہے جس میں مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء کی قرآنی خدمات، ندوی فضلاء کی قرآنی خدمات، فضلائے دیوبند کی قرآنی خدمات، بریلوی فضلاء کی قرآنی خدمات، ادارۂ سرسید مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشاہیر قرآنیات، شیعہ فضلاء کی قرآنی خدمات، جماعت اسلامی کے فضلاء کی قرآنی خدمات اور ہندوپاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات وغیرہ شامل ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ زیر تبصرہ کتاب بھی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ انہوں نے برصغیر میں مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے کئی انقلابی اقدام کئے، اور اس کے لیے قرآن وسنت کو محور بنایا۔ بہت سے غیر اسلامی افکار

کا اسلام کی روشنی میں جائزہ لے کر ان پر مثبت نقد بھی کیا۔اس کتاب کے مصنف ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> اصلاح امت کا جو فریضہ آپ نے انجام دیا،اس کی خصوصیت تعلق مع اللہ کے لیے قرآن وسنت کے ساتھ مضبوطی سے رشتے قائم کرنا رہا،اخلاص وسادگی اور نیک نیتی کے ساتھ ان کی خدمات کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا اور وہ بجا طور پر "حکیم الامت" کہلائے (ص ۱۴)۔

اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ ایک تعارف، جمال القرآن (تعارف)،الفاظ قرآن، ترجمۂ قرآن، تفسیر بیان القرآن کے علاوہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرۃ، سورہ عمران، سورۃ النساء سورۃ الانفال، سورۃ التوبۃ، سورہ بنی اسرائیل، سورۃ النور، سورۃ الاحزاب اور سورۃ الحجرات وغیرہ جیسے عناوین کے تحت بہت سے معاشرتی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

جمال القرآن فن تجوید پر ایک کتابچہ ہے، جس میں تجوید کے بنیادی اصول مرقوم ہیں۔اور الفاظ قرآن قصبہ کیرانہ میں کہے گئے ایک طویل وعظ پر مشتمل پر اثر کتابچہ ہے جس میں قرآن مجید کے حقوق اور اس کے حفظ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔زیر تبصرہ کتاب میں حروف مقطعات کے بارے میں ایک قابل ذکر نقطہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

۔۔۔یہ دونوں (سورتیں) حروف مقطعات سے شروع ہوئیں ہیں،ان دونوں آیتوں میں آیات کو "آیات قرآنیہ" کہا گیا ہے۔ایک جگہ (تلک آیات الکتاب وقرآن مبین) میں کتاب کا لفظ مقدم ہے،اور قرآن مؤخر،اور دوسری جگہ (تلک آیات الکتاب وقرآن مبین) میں کتاب کا لفظ مقدم ہے،اور قرآن مؤخر،اور دوسری جگہ (تلک آیات القرآن وکتاب مبین) میں قرآن مقدم ہے اور کتاب مؤخر، نیز ایک جگہ قرآن نکرہ ہے اور دوسری جگہ معرفہ اور کتاب بھی ایسے ہی ہے۔ان آیتوں میں قرآن کے دو لقب مذکور ہیں۔ایک کتاب (بمعنیٰ کتابت) اور ایک قرآن (بمعنیٰ قرأت) (ص:۲۷-۲۸)

مجموعی اعتبار سے کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔صفحات کے لحاظ سے اس کی قیمت زیادہ ہے۔　　　(فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

غزل

جمیل مانوی

سہارنپور۔۹۸۹۷۵۲۳۸۱۵

نور کی ایک کرن روح کی چلمن سے اٹھے
جو ہر اک دل کو بھگودے وہ صدا من سے اٹھے

پھر ترے حسن تبسم کی ضیاباری سے
آنکھ ملتے ہوئے کچھ خواب نشیمن سے اٹھے

میرے جذبات نے کچھ اور ہی سمجھا ہے تجھے
ورنہ کیوں نام ترا یوں مری دھڑکن سے اٹھے

سرد مہری کی فضا خیر میں تبدیل ہوئی
گرم جوشی سے کئی ہاتھ جو آنگن سے اٹھے

لوحِ ایّام پہ کچھ خونِ جگر سے لکھوں
کیا عجب ہے کوئی شعلہ مرے خرمن سے اٹھے

عقل ودانش بھی جہاں بہہ گئے تنکوں کی طرح
ایسے طوفاں بھی ترے جلوۂ پُرفن سے اٹھے

عصرِ نو چھپ گیا تاریخ کے ملبہ میں جمیل
جانے کب تک یہ دھواں زیست کے مدفن سے اٹھے

غزل

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

نعمانی منزل۔ہمدرد نگر۔جمال پور۔علی گڑھ

عیشِ جہاں کی چاہ بہت ہے
فکر بشر کوتاہ بہت ہے

اپنے خالق کا بندہ ہوں
یہ عزّت ، یہ جاہ بہت ہے

دنیا سے کیا لینا مجھ کو
میرے لیے اللہ بہت ہے

کافر! غور کرے ، تو تجھ کو
آیتِ لَا اِکراہ بہت ہے

سیر جہاں کا حاصل ہی کیا
ایک ہی جلوہ گاہ بہت ہے

فتنہ برپا کرنا ہو ، تو
چھوٹی سی افواہ بہت ہے

دیدۂ عبرت وا کرنے کو
گردشِ مہر و ماہ بہت ہے

عیش و مسرت، بے علموں کو
مجھ کو دلِ آگاہ بہت ہے

دل کا رئیس احوال نہ پوچھو،
دوست یہ دشمن خواہ بہت ہے

غزل

صیقل آشنا کے بعد

ڈاکٹر راہی فدائی ۔ ۹۴۴۸۱۶۶۵۳۶/۷۷۶۰۲۹۲۰۵۰

انا کے نام سے تھا اک بچارا کیا ہوا
بہت روشن رہا اس کا ستارہ کیا ہوا

اسے تھی ماورائے عرش و کرسی کی خبر
ازل کا وہ حقیقی استعارہ کیا ہوا

جلاتا جس کی حدّت سے ہوس کا ہر الاؤ
دہکتا، دندناتا وہ شرارہ کیا ہوا

لپٹ کر سو گیا تن سے، ڈرا سہما تھا بخت
نکلنے کا ملا اس کو اشارہ کیا ہوا

محاسن ابجد و اسود کے اس پر ثبت تھے
فلک پر اڑ رہا تھا وہ غبارہ کیا ہوا

خرد مندانِ دوراندیش میں تھا اس کا نام
منافع کو سمجھتا تھا خسارہ، کیا ہوا

اچانک رخصتی کا قصد تم نے کرلیا
مرے ہم دم، بتاؤ نا، خدا را کیا ہوا

سبھی پر اس کی رنگینی کا رعب و دبدبہ
وہ تھا خوش رنگ و خوش طالع سہارا، کیا ہوا

خطا تم سے ہوئی یا اس سے، دھوکہ کھا گئے
شرافت کی پہل تھی وہ، دوبارہ کیا ہوا

اندھیروں کو اجالے بانٹتا تھا پے بہ پے
دماغوں میں تھا نیکی کا منارہ، کیا ہوا

کرم تھا یا غضب، آغوش میں راہیؔ تھے سب
وہ جو پُرجوش دریا کا کنارہ کیا ہوا

معارف کی ڈاک

مثنوی زیر و بم

مثنوی زیر و بم والا مضمون پڑھا جوں جوں فارسی اشعار سامنے آئے اکثر و بیشتر غلط نظر آئے۔ معلوم نہیں مضمون نگار نے ایسا لکھا یا ایسا کمپوزر نے کیا۔ افسوس کہ اب علمائے ادبیات فارسی شبلی نعمانی و سلیمان ندوی کے ادارے میں فارسی جاننے والے اور فارسی شعری ذوق رکھنے والے بھی نہیں رہے۔ ایک جگہ مضمون نگار نے فارسی لفظ ''جیب'' کا اردو ترجمہ بھی جیب کیا ہے (ص ۷۴)۔ فارسی میں جیب دامن کو کہتے ہیں۔

عارف نوشاہی
naushahiarif@gmail.com

معارف: محترم عارف نوشاہی صاحب: فارسی اشعار میں غلطیاں افسوسناک ہیں۔ اب فارسی جاننے والے لوگ یہاں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ غلطی کے خدشے سے ہم نے مضمون کو آخری پروف ریڈنگ کے لئے صاحب مضمون کو بھیج دیا تھا اور ان کی تصحیح کردہ کاپی ہی چھپی ہے۔

لُبِّ ایمان-خاتمہ بالخیر

۳۲+۱۰۲+۱۰۴۶+۸۴۳=۲۰۲۳عیسوی

(لبّ بضمِّ اوّل و تشدید دوم۔ عربی اسم مذکر بہ معنی عطر، نچوڑ، خلاصہ، مغز۔ اصل، جوہر۔ چیدہ وغیرہ)۔ آسمان شعر و ادب کی بیکراں نیلگوں بساط پر نجانے کتنے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ کتنے سیارے گردش کر رہے ہیں۔ ان ادبی کہکشاؤں کو قلم کی نگاہوں نے اتار اتار کر قرطاس ابیض پر ٹانک بھی دیئے ہیں۔ انہیں میں دو چاند ایسے بھی ہیں جن پر خامہ فنکار نے قدم تو رکھ دیئے ہیں لیکن یہ سفر بہت دقت طلب ہے! چنانچہ رُباعی جیسی باریک چیز کو ہر کوئی چھو نہیں سکتا۔ اسی طرح تاریخ گوئی یعنی مادّۂ تاریخ نکالنا بھی گویا:

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

رُباعی کے چوبیس اوزان کی رشتہ داری صرف زلیخائے ہزج ہی سے ہے۔ کسی نامحرم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں ہے، آزادی نہیں ہے۔ اس بزم ناز میں پابہ زنجیر ہو کر رقص والہانہ کرنا پڑتا ہے۔ اور فنِّ تاریخ گوئی میں شاعری کو ریاضی کے آنگن میں پھول کھلانا پڑتا ہے۔ یہ فن دشوار ترین ضرور ہے مگر نہایت مفید و کارآمد، بڑا لطیف، بے حد خوشگوار اور نہایت عمدہ ہے۔ ہے تو یہ آورد مگر آمد کو الہامی

درجہ مل جاتا ہے اور مطلوبہ تاریخ محفوظ ہو جاتی ہے۔ شاہانِ اسلامیہ کے عہد حکومت میں اس کا آفتابِ اقبال حدِّ نصف النہار پر ضوفشانیاں کرتا ہوا اپنی برق پاشتجلیات سے قدر دانوں کو سرور و مسحور کر کے اپنی آغوش میں ایسے لے لیتا تھا کہ انعامات وخلعات فاخرہ کی برسات ہونے لگتی تھی۔ یہ وہ محلول ہے جس میں ادب وریاضی کی خوشبو مخلوط ہے۔ دونوں کی جنم بھومی فارس (ایران) ہے۔ ایران کے عہد سامانیہ میں بابا ابو شکور بلخی (۲۶۱ ہجری، ۳۹۸عیسوی) نے اپنی مثنوی "آفرین نامہ" میں یہ فن لفظی انداز میں سب سے پہلے پیش کیا:

مرا ایں داستان کشش بگفت از خیال ابرسی صدوسی و سہ بود سال (۳۳۳ ہجری)

گلستان شکور بلخی کا پہلا خوشہ چین انوری ابی ودری ہے، اس کے مقلد خاقانی ونظامی گنجوی ہیں۔ کسائی مروزی، فردوسی، ناصر خسرو اور اسدی طوسی نے اس فن کو حدِّ معراج پر پہنچا دیا۔ مگر انوری ابی وردی وہ راہ نما ہے جس کے نقش قدم پر کارواں در کارواں مسافران سخن نے بادیہ پیمائی کی ہے۔ ایران سے چل کر یہ مسافر ہندوستان آیا تو مغل شہنشاہوں اور نوابین اودھ نے اس کو اپنے دربارِ دُربار میں باعظمت جگہ دی (یہ گوشۂ ایک مضمون پورا الگ سے چاہتا ہے)۔

علمِ ابجد کائنات کے ساتویں پیغمبر حضرت اخنوخ بن یرُد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن حضرت آدم خلیفۃ الارض کا خصوصی عطیہ ہے۔ ابجد کے آٹھوں لفظوں میں عربی کے پورے اٹھائیس حروف تہجی داخل ہیں۔ معنوی اعتبار سے ان الفاظ میں داستان آدم بھی پوشیدہ ہے (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۰ تا ۳۷)۔ یہ الفاظ سریانی زبان کے ہیں، جو بہت بعد میں حضرت اسماعیل ذبیح اللہ اور ان کی والدہ گرامی جناب ہاجرہ کی اپنی زبان عربی کی بنیاد بنی۔ حرفوں کے اعداد بھی حضرت اخنوخ ہی نے مقرر کئے۔ اخنوخ کا تاریخ میں مشہور نام ادریس ہے۔ اسی لئے یہ علم ابجد ادریسی کہلاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام ابتت بھی ہے۔

یہ فن صوری (ظاہری) اور معنوی (باطنی) ہے۔ اس فن میں فارسی اور اردو کے اساتذہ شعراءِ کرام نے دو در جن صنعتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ سب سے آسان وپسندیدہ ومعقول ومقبول صنعتِ سالم الاعداد کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر آخری پورے مصرعے میں مطلوبہ سن کا عدد کم وبیش ہو جائے تو تدخلہ اور تخرجہ کیا جاتا ہے۔ زُبر وبینات سب سے مشکل ہے۔ صفتِ مخلوط، صنعتِ مقلوب وصفتِ نادرہ وغیرہ مشکل ترین تو ہیں، مگر ہیں، کیونکہ تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ فن میں حرفِ آخر کچھ بھی نہیں اور پھر ہمتِ مرداں مدد خدا است یعنی مشکلے نیست کہ آساں نشود۔

کلیات شبلی اردو کے صفحہ ۲۰۵ پر سب سے نیچے علامہ حضرت شبلی نعمانی کا ایک مصرعہ یوں درج ہے:

فرشتے میرے ہاتھوں سے مثنّٰی لیے جاتے ہیں:

۹۹۰+۲۶۰+۴۶۷+۷۰+۶۰۱+۴۵۰+۴۱۴+۶۵=۳۳۱۷

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سن ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۸۷ ہجری میں ہوئی۔ دونوں سنوں کا مجموعہ ۳۳۰۱ ہوتا ہے۔ اس میں سولہ (۱۶) عدد کم پڑ رہا تھا۔ زاہد جعفری نے قطعہ بنایا تو تیسرے مصرعے کے آخر میں لفظ آواز کا تدخلہ کر دیا۔ عدد مکمل ہو گیا۔ قطعہ تاریخ قابل توجہ ہے۔ ملاحظہ فرمایا جائے! (خدا جانے حضرت علامہ مرحوم و مغفور کیا ارشاد کرنا چاہتے تھے؟۔ دخل در معقولات کی گستاخی ہزاروں ہزار معذرتوں کے ساتھ پھر بھی کاوشِ فکر توجّہ طلب ہے):

قلم کو چوم کے سارا نوشتہ لیتے جاتے ہیں
یہ آیاتِ عقیدت ہے یہ صحیفہ لیتے جاتے ہیں
زہے! ''ہمراہِ آواز'' قلم شبلی جزاک اللہ!
فرشتے میرے ہاتھوں سے مثنّٰی لیتے جاتے ہیں!

۳۳۰۱+۱۶=۳۳۱۷

میں نے مکاتیبِ شبلی پر مشتمل شبلی کی آپ بیتی مرتبہ ڈاکٹر خالد ندیم بہ غور پڑھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ کہیں کسی ورق پر مولانا کا مادّۂ تاریخ وفات نہیں ملا۔ البتہ میری یادداشت میں خواجہ الطاف حسین حالی کا ایک شعر محفوظ ہے:

ادیب، ناشر، نقاد، ناظم وفاتِ شبلی ہے عیسوی میں

۱۷+۷۵۱+۱۵۵+۹۹۱=سن ۱۹۱۴ عیسوی

خواجہ حالی کو مولانا کی چار حیثیتوں سے الہام ہوا تو وہ مادّۂ تاریخ وفات بن گیا۔ آج یہ سطریں لکھتے لکھتے مجھ کو ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جب سیالکوٹ میں علامہ اقبال اور ان کے استاد سید میر حسنشاہ کو سر سید احمد خاں کے انتقال کی خبر ملی تو علامہ نے: ''اني متوفيك ورافعك إلى ومُطهِّرُكَ'' سے تاریخ نکالی اور مولانا شاہ صاحب ''غفرَلَہ'' سے مادّہ برآمد کیا (۱۳۱۵ھ)۔

اس کی روشنی میں اس خاکسار کو قرآن حکیم کی سورۂ یٰسین کی آیت نمبر گیارہ کا یہ پاکیزہ ٹکڑا یاد آ گیا ''فبشرہُ بمغفرة''۔ میری روح نے آواز دی: جلدی سے لکھ لے۔ قلم کو چوم کر بسم اللہ کہہ کر جب عدد جوڑا تو سالم الاعداد نکلا۔ اسی لیے میں اس فن کو تائید غیبی اور الہامی مانتا ہوں۔ ایمانی دلیل یہ ہے کہ یہ- اَعدادی فن۔ یہ اسرارِ الٰہی - خالقِ لوح و قلم کے ایک عظیم نبی ﷺ کا بتایا ہوا ہے۔ حضرت ادریس اس

کائنات کے سب سے اوّلین مُدرس کا نام ہے (ادریس کی وجہ تسمیہ یہی ہے!)۔ رہے نام اللہ کا۔

ف+ب+ش+ر+ہ+ب+م+غ+ف+ر+ہ

۸۰+۲+۲۰۰+۳۰۰+۵+۲+۴۰+۱۰۰۰+۸۰+۲۰۰+۵) (سن ۱۹۱۴ عیسوی)

فقط تمام شد۔ باحُدودِ خاتمہ بالخیر سن ۱۹۱۴ عیسوی

۸۱۰+۳۳+۲۲+۱۰۴۶+۳

زاہد جعفری

جعفری باغ۔ جلالپور۔ فیض آباد۔ یوپی۔ ۲۲۴۱۴۹

Mob. 9452652488

رسید کتب موصولہ

اسفار نبوی ﷺ: مولانا انتخاب عالم اعظمی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند یوپی، صفحات ۳۶۰۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۱۸۸۱۶۶۷۰

باکمال ہستیاں: مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی، الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ، صفحات ۳۲۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۲۶۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

بزمِ رفتہ: محمد اویس سنبھلی، دانش محل امین آباد لکھنؤ۔ صفحات ۲۸۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء قیمت ۳۲۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۷۹۲۳۶۱۵۳۳

جماعت المسلمین بھٹکل تاریخ وخدمات: محمد الیاس فقیہ احمد الندوی، جامعہ اسٹریٹ بھٹکل، کرناٹک۔ صفحات ۶۷۵، سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت درج نہیں۔ موبائل نمبر: ۸۳۸۵۲۲۶۳۶۰

ذکر محمود (مجموعۂ مضامین): مرکز الامام ابی الحسن الندوی، دار عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی، صفحات ۵۲۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۷۹۲۶۴۶۸۵۸

مسلم معاشرہ میں خواتین کا علمی وادبی ذوق: مولانا بدر الحسن قاسمی، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ، صفحات ۲۶۴۔ سال اشاعت ۲۰۱۷ء، قیمت ۱۵۰ روپے، موبائل: ۹۹۳۴۱۸۸۹۹۷

مشاہیر ومعاصرین: ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی مرتب: مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ صفحات ۵۶۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۸۹۶۰۹۹۷۷۰۷

معالم ومآثر: ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی، مکتبہ الحسنی، ملا پلے، حیدر آباد، صفحات ۱۴۰۔ سال اشاعت، قیمت وموبائل نمبر: درج نہیں۔

نقوشِ زندگی (خودنوشت آپ بیتی): ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن، انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی صفحات ۱۹۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۲۵۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۳۴۶۱۰۶۱۲

یادِ یارِ خوش مزاج: محمد انس حاجی فقیہ، جامعہ اسلامیہ، بھٹکل۔ صفحات ۱۵۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت و موبائل نمبر: درج نہیں۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print APR 2023 Vol. 210/04

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״ ״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״ ״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״ ״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״ ״	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	״ ״	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-